عزائے حسینؑ پر تاریخی تبصرہ

سید العلما جناب مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ

تعارف

بنی آدم کو انسانیت کی اعلیٰ ترین اور بلند ترین تعلیم دینے کے لیے واقعۂ کربلا مشیت کی ایک طے شدہ بات تھی اس لیے امام حسینؑ نے بھی یہ چاہا کہ یہ اہم کارِ الٰہی کربلا کی محدود سرزمین میں دفن نہ ہونے پائے۔ آپ نے اس منزل کے ہر قدم پر تدبّر کی انتہا کر دی، جس کے نتیجہ میں دشمن نے جن جن باتوں سے اس کو چھپانا چاہا وہی باتیں اس واقعہ کو مشتہر کرنے میں معین ہوئیں۔ جن باتوں سے مخالفین نے اپنے عمل کو صحیح قرار دے کر سربلندی چاہی وہی اُن کی پستی کا سبب بنیں اور بظاہر بے یار و مددگار امام حسینؑ کی بلندی یہاں تک پہنچی کہ موقع سے فائدہ اُٹھانے والوں نے صرف لفظ حسینؑ سے سلطنتیں حاصل کر لیں اور دنیا کے تقریباً ہر گوشہ میں آپ کی یاد منائی جانے لگی۔ اس یاد کو مختلف جگہ کے لوگ مختلف طرح پر انتہائی عقیدت کے ساتھ مناتے ہیں۔

دنیا ہمیشہ ہر طرح کے لوگوں کا مجموعہ رہی ہے۔ آج بھی کچھ ایسے ہیں جو عزائے حسینؑ کے سلسلے میں مختلف طرح کے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ، کوئی عزاداری کو معاذ اللہ بُت پرستی کہتے ہیں۔ ان معترضین کو اس کتاب میں بہت مُسکت فطری اور عقلی جوابات دیے گئے ہیں۔

عزائے حسینؑ کس کس طرح کہاں کہاں قائم ہوئی اس کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آخر میں ہندوستان کی عزاداری کا ذکر ہے۔ یہ سب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک بے نظیر کتاب ہے۔ یہ کتاب جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہٗ کے مواعظ کا مجموعہ ہے جو جناب موصوف نے ایک سال مدرسۃ الواعظین میں فرمائے تھے۔ بعض حالات کی بنا پر یہ کتاب جس طرح پر شارٹ ہینڈ رائٹر صاحب نے لکھ کر دی اُسی طرح پر چھپ گئی جس کو اس میں کچھ کمیاں رہ گئیں، اسی کے ساتھ پریس نے بھی بے توجہی سے کام لیا ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

خادم مشن :- سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین

وآلہ الطاہرین۔

تمہید

"عزا" کے معنی لغتِ عرب میں صبر کے ہیں اور تعزیت کے معنی ہیں صبر دلانا اور اسی بنا پر پرسا دینے یا تسلی اور دلاسے کے الفاظ صرف کرنے کو تعزیت کہا جاتا ہے۔

مگر اصطلاحی طور پر جس طرح اکثر لفظوں کے معنی اصل کی مناسبت سے کسی خاص مفہوم میں محدود ہو جاتے ہیں۔ اسی طور پر "عزاداری" کی لفظ مخصوص ہو گئی ہے اُن مظاہرات غم کے ساتھ جو حضرت امام حسینؑ کی یاد میں قائم کیے جاتے ہیں۔

"عزاداری" کی لفظ "تعزیہ داری" سے عام ہے۔ تعزیہ تو مخصوص ایک چیز ہے ان مظاہرات غم میں سے لیکن عزاداری میں مجلس، ماتم اور جس طرح سے اظہار غم ہو وہ سب داخل ہے۔

دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ جو فریق فاتح ہوتا ہے وہ اپنی جنگ اور اس کے نتیجہ کا بڑے پیمانہ پر اعلان کرتا ہے اور مختلف صورتوں سے اُس کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ واقعۂ کربلا کے بعد ایک عرصہ تک ایسا ہی ہوا اور جو ظاہری طور سے فاتح تھا یعنی یزید اور اس کے ہوا خواہ انھوں نے بخیالِ خود اپنے فتح کے اعلان کی کوششیں کیں اور اُس کے اظہار کی مختلف

صورتیں اختیار کیں۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد نتیجہ برعکس ہو گیا۔ اب جو اعلان کر رہا تھا اُس کی طرف سے کوشش اخفاء کی ہو گئی اور دوسرا فریق جو اُن کے خیال کے مطابق مغلوب تھا اُس کی طرف سے مختلف صورتیں اعلان اور اشاعت کی اختیار کی گئیں اور پھر یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔ یہ لوگ برابر اشاعت کی کوشش کرتے رہے اور اس کے خلاف اکثر اوقات ایسی کوشش ہوتی رہی کہ اس اشاعت کو صدمہ پہنچایا جائے اور اس اعلان و اظہار کو رد کیا جائے۔

جہاں تک غور کیا جاتا ہے خود امام حسینؑ نے جو صورتیں اختیار فرمائیں وہ پہلے ہی سے اپنے مقصد اور اپنے نتیجہ کی اشاعت کی ذمہ دار تھیں۔ آپ کی مدینہ سے مکہ کی طرف اور پھر مکہ سے ہجرت اور خاص موقع حج پر روانگی اور پھر عراق کی طرف تشریف لانا اور اہل حرم کا ساتھ لانا۔ یہ تمام چیزیں ایسی تھیں جن کے ذریعہ سے گویا امام حسینؑ نے خود اس سلسلۂ اعلان و اظہار کو جاری کر دیا تھا جو اب تک جاری ہے۔ یہ علم اگر آج ہم اٹھاتے ہیں تو حضرت امام حسینؑ نے خود ایسا موقع دیا تھا کہ نیزوں پر سروں کے بلند کرنے سے اُن کی مظلومی کا علم خود دشمنوں کے ہاتھوں اُٹھے۔

دشمن جس کو سمجھ رہے تھے اپنا اظہار فتح وہ امام حسینؑ کے مقصد کی اشاعت تھی اور اس کے لیے خود امام حسینؑ نے سامان کیا تھا اور اس کے لیے اسباب فراہم کیے تھے۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک معمولی انسان جو کوئی کام انجام دے ایسا کہ اُس کا نام زبانوں پر آنے لگے اور لوگ اس کو پہچاننے لگیں تو اُس کے خلاف مختلف صورتوں

سے غلط بیانات اور الزامات کی اشاعت ہوتی ہے۔ یہ معمولی انسانوں کے لیے ہوتا ہے
جن کے ہاتھوں کسی کے تخت و تاج کو خطرہ نہیں، کسی کے کسی بڑے مقصد کو نقصان نہیں
پہنچتا۔ چہ جائیکہ امام حسینؑ جو سلطنت بنی امیہ کے تخت کو، کچھ خاص افراد کے تخت
سلطنت کو نہیں بلکہ اُس پوری نسل، پوری قوم بلکہ اُس پورے نظریہ کے تخت سلطنت
کو اُلٹنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور محسوس ہو رہا تھا کہ آپ اس مقصد میں کامیابی حاصل
کرنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ حکومتِ وقت کی مشینری کتنی تیزی کے ساتھ متحرک ہونا
چاہیے تھی اُن کے خلاف مختلف غلط باتیں عائد کرنے کے لیے جو آپ کے مقصد کی پامالی
کا باعث ہوں مگر حضرت امام حسینؑ نے اپنے زمانۂ حیات سے اپنے مقصد کی اشاعت کو اتنا
مکمل کر دیا تھا اور واقعۂ کربلا میں خود ایسے اسباب اپنے ساتھ فراہم کر دیے تھے جن کی
وجہ سے دشمن کی زبان بند ہو گئی اور کچھ بن ہی نہ پڑا کہ کیا بہانہ کیا جائے جو امام حسینؑ
کے قتل کا جواز پیدا کر سکے۔ کوئی بہتان دشمنوں سے ممکن ہی نہ ہوا کہ وہ امام حسینؑ کی طرف
منسوب کر سکیں۔ حالانکہ جناب رسالت مآبؐ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے خود فرمایا :-

کثرت علی القالۃ فمن کذب علی متعمداً فلیتبوّ أ مقعدہ من النار

(یعنی) میری طرف غلط اقوال کی نسبت دینے والے بہت ہو گئے ہیں تو جو شخص میری طرف
کسی جھوٹ کی نسبت دے گا وہ اپنی جگہ آتش جہنم میں سمجھ لے۔ دوسرے معصومین
کو بھی اسی طرح کے بہت سے اُمور سے سابقہ پڑا چنانچہ ابن ابی الخطاب نے اصحاب ائمہ
میں داخل ہو کر بہت سی غلط چیزیں امام کی طرف منسوب کر دیں اور اس شخص پر حضرت کو

لعنت فرمانا پڑی۔ پھر جب ائمۂ معصومین اور خود جناب رسالت مآبؐ کو اس طرح کی
غلط بیانی سے سابقہ پڑا تھا تو ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ اسی سلسلہ کی ایک فرد
تھے اور اتنے بڑے اہم کام کے لیے کھڑے ہوئے تھے تو بھلا دشمن کب چوک سکتا تھا کہ
آپ کی طرف غلط اُمور کی نسبت نہ دیتا جن سے آپ کی حقّانیت مشتبہ ہو جاتی

ایک ندا اسی گنجائش لی تھی۔ اقوال کے گھوڑے دوڑانے کی اور وہ اُس وقت کہ جب
آپ نے تنہائی میں عمر سعد سے گفتگو فرمائی ہے تو یہ بات بنا ڈالی کہ حضرت نے فرمایا تھا کہ
مجھے یزید کے پاس جانے دو۔ میں براہِ راست اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔
یہ بات بنا لی گئی تھی جس کی رد عقبہ بن سمعان نے جو واقعہ کربلا کے بعد بحیثیت چشم دید گو
کے باقی رہ گئے تھے کی اور کہا کہ میں ہر وقت کی گفتگو کو معلوم کرتا تھا کبھی حضرت امام حسینؑ
نے اپنی زبان سے یہ نہیں فرمایا کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

بہرحال یہ تو اس سے ثابت ہو گیا کہ ایک ذرا سا موقع بھی دشمن کو ملا تو اس
نے اُس موقع سے فائدہ اُٹھانا نظر انداز نہیں کیا۔ کوئی ایسا موقع دشمن ہرگز نہیں چھو
سکتا تھا جس سے امام حسینؑ کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے لیکن امام حسینؑ کی حقانیت
اور آپ کا تدبّر وہ تھا کہ آپ نے ایسی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی۔

آپ سمجھتے تھے کہ یہ فیصلہ کن جنگ ہے حق اور باطل کی۔ اس سے پہلے اگر رسول
کے کسی حکم کو مشتبہ کر دیا گیا تو وہ پھر بھی جزئی حیثیت رکھتا تھا لیکن ایک ایسی فیصلہ
جنگ حق و باطل کی جس کی مثال نہ اس سے پہلے کبھی آئی تھی اور نہ اس کے بعد آ

والی تھی۔ یہاں اگر کوئی اس طرح کا شبہہ پیدا کر دیا جاتا تو مقصد ہی اس جہاد کا ختم ہو جاتا۔ اس لیے حضرت امام حسینؑ نے انتہائی کوشش اس بات کی فرمائی کہ کوئی اس قسم کی صورت پیدا نہ ہونے پائے اور آپ کی مظلومی اور دشمن کا ظلم نمایاں رہے۔

فتح کا نشہ سمجھیے یا سیاست کی غلطی کہ اس کے بعد ایک عرصہ تک دشمن بھی مقصد حسینؑ کا مددگار بن گیا۔ یعنی وہ تمام مظالم کی اشاعت اور فتح کے مظاہرہ میں دشمن کے اعلانات سب امام حسینؑ کے مقصد کی تکمیل کر رہے تھے۔ یہی نہیں بہت سے صوبے مملکت اسلامیہ کے جن کو اہلِ بیت سے بے خبر رکھا گیا تھا اور اس کے لیے بہت کوشش کی گئی تھی وہ اپنے ہی ہاتھ سے باخبر کیے گئے۔ دمشق میں اہلِ بیتِ رسولؐ سے ناواقفیت کی انتہا یہ تھی کہ ایک مرتبہ جب مسجدِ جامع میں وہ بدترین رسم ادا کی جا رہی تھی جس کو نمازِ جمعہ کے بعد خطبہ کا ایک جزو بنا لیا گیا تھا یعنی جناب امیر المومنین کی شان میں کلماتِ نازیبا کا استعمال۔ تو ایک شخص نے اپنے پاس کے بیٹھنے والے نمازی سے پوچھا کہ یہ کون ابوتراب ہیں جن کے متعلق یہ الفاظ زبان پر جاری کیے جاتے ہیں؟ اُس نے کہا مجھے نہیں معلوم یہ کون شخص ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ عرب کے ڈاکوؤں میں سے کوئی ہوگا۔

یہ انتہا تھی ناواقفیت کی۔ اسی طرح شام کے ایک شخص سے جناب فاطمہؑ کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے ایک عجیب وغریب شجرہ بتلایا۔ باپ کو شوہر، شوہر کو باپ اور بیٹی کو زوجہ۔ یہ تھا اس بارے میں اس کا مبلغ علم۔ غرض کہ کبھی اُن کے سامنے یہ حقیقت پیش ہی نہیں ہوئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ بنی امیہ وارث

جائز پیغمبر کے ہیں اور اُن کے سوا رسولؐ نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی ہے۔

جن لوگوں کو یہاں تک بے خبر رکھا گیا تھا اب اُنھیں صحیح کے اعلان کے واسطے خود باخبر بنایا گیا۔ اور حکومت ان افراد کے نام تک پر پردہ ڈال رہی تھی اُس نے اُن کے مقدس اشخاص تک کی زیارت کرادی۔ وہ کٹے ہوئے سر ہی اور لٹے ہوئے قیدی ہی سہی پھر بھی جلال و عظمت کے آثار چھپے تھوڑی رہ سکتے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں یہ بھی بتلا دیا بلکہ آنکھوں سے دکھلا دیا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور پھر ان میں سے جو زندہ اشخاص تھے۔ اُن کا اپنا تعارف خود کرا دیا اور یہ خود ان کے لیے سب سے زیادہ خطرناک چیز ہو سکتی تھی یعنی اگر فقط سرہائے شہداء کو بھیج دیا گیا ہوتا تو لوگوں کو صرف افسوس ہو کر رہ جاتا اور یہ کہ پیغمبر کی جو یادگاریں اب تک باقی تھیں اور جن کی طرف جاذبیت قلوب کے مواقع حاصل تھے اُن کو قید رسیدہ ہی سہی، طوق و زنجیر میں سہی لیکن ناواقف دنیا کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا گیا اور اُن کی فصاحت و بلاغت کے جوہر کھلنے کا موقع دیا گیا۔ خوشی کا نہ سہی۔ مگر حالات ایسے پیدا کیے کہ وہ مخفی جواہر جنھیں پوشیدہ رکھا جارہا تھا۔ اُنھیں ایک مرتبہ دنیا کے سامنے نمایاں ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ چاہے زینب کبریٰ کا خطبہ ہو، چاہے ام کلثوم کا خطبہ ہو اور چاہے امام زین العابدین کا خطبہ ہو تمام اس قسم کے بیانات تھے جو دنیا کی آنکھوں سے پردوں کو ہٹا رہے تھے اور یہ ایک فطری چیز ہے کہ ایک انسان اگر کسی بات سے بے خبر رکھا گیا ہو اور ایک دم سے باخبر ہو تو اُسے اس امر پر غصہ آتا ہے کہ اللہ ری مکاری! اتنی مدت سے ہم کو ان واقعات

سے ناواقف رکھا گیا اور اب ہم کو بتلایا جا رہا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تھوڑے عرصہ میں حکومتِ وقت کو یہ احساس شروع ہو گیا کہ ہماری اس طرح کی کوشش ہمارے مقصد کے لیے تباہ کن ہے اور ہم نے جو کیا اپنی قبر اپنے ہاتھ سے کھودی۔ اب کوششیں شروع ہوئیں چھپانے کی اور مظالم پر پردہ ڈالنے کی۔ اظہارِ رنج و تاسف اسی پردہ داری کے لیے تھا۔ ابنِ مرجانہ کو برا کہنا اور اپنی ذمہ داری کو اُس کے سر رکھنا اسی پردہ داری کے لیے تھا جس نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، آج تک ہوا خواہان بنی امیہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یزید کے جو اقوال پیش کیے جاتے ہیں کہ خدا لعنت کرے ابنِ مرجانہ پر۔ میں ہوتا اُس موقع پر تو ایسا نہ کرتا۔ یہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں کہ اُس نے اپنا گھر خالی کرا دیا اور اُس کی عورتیں گریہ و بکا میں شریک ہوئیں مگر یہ سب باتیں بعد کی ہیں یعنی وقت سے احساسِ شکست شروع ہوا اُسی وقت سے ان سب باتوں کی ابتدا ہوئی اور آج تک جاری ہے۔ اس لیے کہ فتح کا تخیل تھوڑے عرصہ کے لیے تھا اور شکست کا احساس دائمی ہے یعنی صرف چند دنوں کے لیے وہ سمجھے کہ ہم جیت گئے اور اس کے بعد مستقل طور سے یہ احساس قائم ہو گیا کہ ہم ہارے اور ایسے ہارے کہ جس کے بعد جیتنا ممکن نہیں۔ اب صورت یہی ہو سکتی تھی کہ جو کچھ ہوا اُس کو چھپانے کی کوشش کی جائے اور جو سچے مسلمان تھے جن کو ان ظالموں سے نفرت تھی اب اُن کو کد پیدا ہو گئی کہ نہیں ہم ان مظالم کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کریں گے اور ان کی یاد کو ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ حقیقت میں واقعۂ کربلا کی یاد قائم رکھنے کے اسباب کا فراہم کرنا ہی ہے جس کا

نام اصطلاحی طور پر "عزاداری" رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی صورتیں مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں مختلف شکلوں میں تبدیل ہوتی رہیں اور مختلف لباس پہنتی رہیں لیکن روح اور حقیقت اور جوہر سب کا ایک تھا۔

مخالفین کی طرف سے کچھ عرصہ تک یہ کوشش جاری رہی کہ اس یاد کو بھلا دیا جائے۔ جب اس میں ناکامی محسوس ہوئی تو یہ ترکیب کی گئی کہ اس یاد کے مقابلہ میں اور دوسری یادیں دلائی جائیں تاکہ یہ مل کر دوسری چیزوں کے ساتھ بے اثر بن جائے۔ یہ ہوتا رہا بہت مدت تک، جب اس میں بھی ناکامی ہوئی اور واقعہ کربلا کے خصوصیاتِ امتیازی ایسے ثابت ہوئے کہ اس کی یادگار رہنی تھی اس سے آگے بڑھتی گئی اور اس کے مقابلہ میں جو چیزیں قائم ہوئیں وہ وقتی ثابت ہوئیں اور پھر بعد میں فنا ہو گئیں تو اس کے بعد یہ تدبیر شروع ہوئی کہ جس چیز کو غیر فطری لباس پہنایا جائے وہ فنا ہو جائے گی اس لیے واقعۂ کربلا کی یاد قائم کی جائے مگر صورت میں تبدیلی کر دی جائے یعنی بجائے مظاہرۂ غم کے مظاہرۂ خوشی کیا جائے۔ اس کے لیے تاویلیں تراشی گئیں اور دلائل بنائے گئے، مثلاً کہا گیا کہ شہادت سے بڑھ کر رفیع درجہ کیا ہو گا۔ حضرت امام حسینؑ کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا تو اس پر اظہارِ مسرت ہونا چاہیے اظہارِ غم نہ ہونا چاہیے۔ یہ کہا گیا کہ روئیں وہ جو مماتِ شہداء کے قائل ہوں اور جب شہداء کو زندۂ جاوید سمجھا جاتا ہے تو پھر ان پر ماتم کی کیا ضرورت ہے۔

حقیقت میں مقصد وہی تھا کہ یاد فراموش ہو لیکن چونکہ براہ راست اس سعی

ہیں ناکامیابی ہو چکی تھی لہٰذا اب یہ صورت اختیار کی گئی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ غم کا مظاہرہ اس موقع پر فطری ہے اور خوشی کا مظاہرہ غیر فطری ہے۔ دوسری طرف مظاہرہ غم میں جاذبیت زیادہ ہوتی ہے، مظاہرۂ مسرت میں وہ کشش نہیں ہوتی اس لیے یہ کوشش کی گئی کہ غم کی جگہ خوشی لے لے۔ چنانچہ سلطنتوں نے یہ کوشش کی کہ یوم عاشورا کو عید منائی جائے اور مدتوں اس پر عمل کیا گیا۔ یہ چیز اپنی اصلی شکل میں کامیاب تو نہیں ہوئی مگر اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج آپ ہندوستان کے اکثر مقامات پر جا کر دیکھیے تو آپ کو ان مظاہرات مسرت میں سے بہت سی چیزیں مخلوط ملیں گی ان مظاہرات غم کے ساتھ جنھیں سچے مسلمان ہمیشہ کیا کرتے تھے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں عشرۂ محرم میں آتش بازی چھڑائی جاتی ہے، ریچھ اور شیر کی کھال اوڑھ کر مختلف سوانگ بنائے جاتے ہیں، بانک، پٹہ کے کرتب دکھائے جاتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں جزو عزاداری خیال کی جاتی ہیں۔ جب ہم نے غور کیا تو ان چیزوں کا کوئی تعلق مظاہرۂ غم کے ساتھ سمجھ میں نہ آیا۔

مزید غور کرنے پر اس کا سبب ظاہر ہوتا ہے کہ النّاس علی دین ملوکہم "لوگ بادشاہوں کے راستے پر چلتے ہیں۔" سلطنتیں دو قسم کی تھیں۔ ایک وہ جنھوں نے مظاہرۂ غم کیا۔ دوسرے وہ جنھوں نے مظاہرۂ سرور کیا۔ مسلمانوں نے اصل محرکات پر غور کیے بغیر تقلیدی طور پر کچھ وہ مراسم لے لیے، کچھ یہ مراسم لے لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غم کے مظاہرات کے ساتھ ساتھ بہت سے سرور کے مظاہرات شریک ہو گئے اور یہ سب جزو عزاداری قرار دے دیے گئے۔

وہ مسلمان جو امام حسینؑ کا احترام کرتے ہیں اور حضرت کے حادثۂ شہادت کو واقعی قابلِ رنج و غم چیز سمجھتے ہیں اُن کا فرض تھا ہے کہ وہ مسلمانوں کو عزاداری کا صحیح مفہوم سمجھائیں اور توجہ دلائیں کہ تم جو امام حسینؑ کی عزاداری کرتے ہو تو کیوں ایسی صورتیں اختیار کرتے ہو جن سے مقصدِ عزا فوت ہو جائے۔ بہت ممکن ہے کہ اگر نیک نیتی کے ساتھ سمجھایا جائے تو اس کا اثر ہو اور وہی صورتیں اختیار کی جائیں جو کسی مصیبت پر اظہارِ رنج کے لیے مناسب ہیں۔

عزاداری کا پہلا دور شروع شروع میں رنج و ملال کے جو مظاہرے دنیا کی آنکھوں کے سامنے آئے وہ کسی خاص مقصد کو سوچنے پر موقوف نہ تھے بلکہ فطرت کی تحریک کا ایک فطری نتیجہ تھے۔ کیونکہ وہ افراد جو پسماندگانِ امام حسینؑ تھے فطری طور پر ہمہ تن رنج و غم بنے ہوئے تھے اور دنیا میں کوئی انسان تصور میں نہیں آسکتا جو اتنا رنجیدہ ہو جتنا کہ امام حسینؑ کے اہلِ حرم۔

غور تو کیجیے کوئی وہ ماں جس کا جوان بیٹا میدانِ جنگ میں نیزہ کھا کر دنیا سے رخصت ہو گیا ہو، کوئی وہ بہن جس کا بھائی تین دن کا بھوکا اور پیاسا شہید ہو گیا ہو، کوئی وہ ستم رسیدہ جس کا چھ مہینہ کا بچہ نشانۂ تیرِ ستم ہو گیا ہو، کوئی وہ بیوہ جس کا شوہر شہید ہو گیا ہو۔ کون اُن افراد میں ایسا تھا جس کے دل پر ایک نہیں بلکہ کئی کئی داغ نہ ہوں اور پھر کئی داغ اگر مختلف اوقات میں ہوں تو ممکن ہے کہ ایک غم کے فراموش ہونے کے بعد دوسرا غم پیدا ہو لیکن جب کہ غم بالائے غم ہو، داغ بالائے داغ ہو۔ ایک بار اظہارِ تاثر کا موقع نہ ملا ہو کہ دوسری مصیبت آگئی ہو تو ایسی صورت میں ان افراد کی آہ و زاری اور ان کا نالہ و شیون۔ وہ تو ایک فطری

چیز ہے جس کے لیے یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ اُنھوں نے اس مقصد کے لیے ایسا کیا اور پھر اگر نالہ و شیون سے رد کا بھی جا رہا ہو تو کوئی شک نہیں کہ مصیبت کا احساس اور تیز ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ نالہ نہ بھی کریں تب بھی اُن کی خاموشی ایک مرقع فریاد ہو گی جو دوسروں کو نالہ زن کر دے۔

"افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" اگر ایک افسردہ دل بھری محفل میں آ جائے تو وہ ہنستی ہوئی محفل کو رنجیدہ بنا دے گا چہ جائیکہ انسانی دل رکھنے والے افراد کے سامنے وہ چاہے دشمن ہی کیوں نہ ہوں لیکن دشمنوں میں سے ہر ایک کا دل ویسا سخت تو نہیں ہوتا۔ مصیبت تو وہ چیز ہے کہ وہ دشمن جو ذمہ دار مظالم ہو منھ پھیر کر رونے لگتا ہے۔ چہ جائیکہ ایسے افراد جو مخالف جماعت میں شامل ہوں لیکن کوئی ویسی قساوتِ قلبی نہ رکھتے ہوں اُن کے سامنے اتنے شکستہ دل اور تباہ حال مجسمے ہمہ تن رنج و مصیبت بنے ہوئے آ جائیں اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ اہلِ حرم خاموش بھی تھے تو دوسروں میں کہرام برپا تھا۔ جس راستے سے اہلِ حرم گزر جاتے تھے وہاں تماشائی جو بالائے بام تماشا دیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے اُن میں ایک شورِ نالہ و شیون کا برپا ہو جاتا تھا۔ یہ سب کوفہ میں ہوا۔ اس کے بعد دمشق میں ملکِ شام کے اندر۔ انتہا یہ تھی کہ دربارِ یزید میں اہلِ حرم خاموش اور یزید کے گھر کے اندر سے رونے پیٹنے کی آوازیں بلند۔ یہ اثر اُن کے خاموش صبر سے دنیا والوں پر پڑ رہا تھا۔ پھر اگر ان حضرات کو کچھ اور موقع مل جاتا اور اُن کے نالہ و شیون کی آواز بلند ہو جاتیں، تو وہ کیا بے پناہ سیلاب ہوتا رنج کا۔ چنانچہ جب یزید نے کہا کہ میں رہا کرتا

ہوں۔ کوئی خواہش ہے؟ تو جو خواہش پیش کی گئی وہ یہی تھی کہ ہم اپنے عزیزوں کو دل بھر کر رو دیے نہیں۔ مکان خالی کرادو اور ہم ماتم کر لیں۔ یزید اب ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ کیوں کہ اُس کو ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اب ان لوگوں کی دلجوئی کی جائے۔ اس لیے یہ سمجھتے ہوے کہ اس کا اثر میرے لیے کتنا بڑا ہو گا، پھر بھی ایسا کیا اور تاریخ گواہ ہے کہ جب اہلِ حرم اُس مکان میں آ رہے تو کوئی عورت دمشق میں ایسی نہ تھی جو تعزیت کے لیے اہلِ حرم کے پاس نہ آئی ہو اور متاثر واپس نہ گئی ہو۔

یہ ہے وہ عزاداری جو پہلے پہل دشمن کے دارالسلطنت میں ہو رہی تھی اور یہاں جو آیا اہلِ حرم کے پاس، وہ ایک مستقل اثر لے کر واپس گیا۔ یعنی یہ صف جو بچھا دی گئی تھی ظاہر ہیں تو تین دن یا سات دن کے بعد اُٹھا دی گئی مگر اس سے ہزاروں دلوں میں اہلِ حرم نے صفِ ماتم شیئں بچھا دی جس کا بچھنے کے بعد پھر اُٹھنا ممکن نہ تھا۔

جب دمشق سے قافلہ روانہ ہوا تو درمیان میں روایت بتلاتی ہے کہ یہ قافلہ کربلا بھی آیا۔ گویا زیارت کی بھی رسم قائم ہو گئی۔ ظاہر ہے جس کو یہ حسرت ہو کہ ہم نے دفن نہیں کیا، اُس کو یہ دیکھنے کا کتنا شوق ہو گا کہ دفن ہو چکے یا نہیں۔ قبر کی زیارت کے لیے آئے تھا اہلِ حرم اور اس کے بعد تاریخ کے بتلانے کی ضرورت نہیں کہ زمینِ کربلا پر واحسیناہ واحسیناہ کے نعرے بلند ہوے۔ یہ چیزیں وہ ہیں کہ بیان کرنے والا نہ بھی بیان کرے پھر بھی ہر شخص ان کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس سے قرب و جوارِ کربلا میں جتنے بھی قبیلے بسے تھے تھے اور جتنی بھی جماعتیں تھیں، سب پر ایک مستقل اثر ہوا۔ اور اس کے بعد جب یہ

حضرات اُس لٹے ہوئے وطن میں پہنچے جس کا نام مدینہ ہے تو آپ ہی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ اُن کے متأثرات کا کیا عالم ہوگا۔ کس شان سے گئے تھے اور اب کس شان سے واپس ہوئے۔ تمام واقعہ کربلا اس وقت تازہ تھا اور ہر وقت تازہ رہا اور جتنے افراد تھے مدینہ کے خواہ دوست ہوں یا دشمن وہ سب یکساں اثر محسوس کر رہے تھے اور پھر وہ افراد جو واقعہ کربلا میں موجود نہ تھے لیکن شہید ہونے والوں سے کوئی نسبت رکھتے تھے۔ اُن کے تو غم و رنج کی کوئی انتہا نہیں ہو سکتی کیونکہ پھر بھی آنکھوں سے دیکھنے پر تسلی ہوتی ہے مگر جیسے ام البنین کہ جو واقعۂ کربلا کے وقت زمینِ کربلا میں موجود نہیں تھیں۔ ایسا اعتماد تھا حسینؑ پر کہ پوری اولاد حسینؑ پر نثار کر دی اور خود مدینہ میں رہیں لیکن اس کے بعد جب واقعات معلوم ہوئے تو عالم کیا تھا۔ عمر بھر تاریخ بتلاتی ہے کہ بس ادھر دن چڑھا اور جنۃ البقیع میں چلی گئیں۔ دن بھر رویا کرتیں اور اتنا دلدوز مرثیہ پڑھتی تھیں کہ مروان جو اُدھر سے گزرتا تو وہ بھی ٹھہر کر سُنا کرتا اور رویا کرتا تھا۔ یہ مروان بڑا سخت دشمن خاندانِ رسالت کا ہے مگر ان نوحوں کی تاثیر یہ تھی کہ دوست و دشمن کے دل پر برابر سے اثر ہوتا تھا۔

جیسا کہ میں نے شہدائے کربلا کے حالات کی کتاب میں لکھا ہے۔ یہ ام البنین کا مرثیہ فقط دل دوز ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ اُس سے یہ پتہ بھی چلتا تھا کہ وہ عباس ایسے بہادر کی ماں ہیں۔ ایک مرثیہ میں اُنھوں نے کہا ہے کہ " ہائے مجھے 'ام البنین' کہہ کر کیوں پکارتے ہو کیونکہ ام البنین کے معنی ہیں بیٹوں کی ماں۔ تھے میرے بیٹے ایک وقت میں مگر اب تو سب جا چکے "۔

دوسرا امر ثیہ جسے میں کہتا ہوں کہ اس میں بہادرانہ شان پائی جاتی ہے اس مضمون

کا ہے کہ :-

"مجھے نہیں بھولتا اپنے شیر عباس کا وہ حملہ جو اس نے دشمنوں پر کیا تھا۔ ہائے

میرے شیر کو اس وقت مارا جب ہاتھ قلم ہو چکے تھے، اس وقت نہ مارا جب ہاتھ

موجود تھے"

ایسے ہی ام ہانی وغیرہ کے نوحے۔ عزاداری کی ابتدا اور ایسے فطری تاثرات

سے ہوئی تھی جن کا مستقل اثر پائدار اور ناقابل فراموش حیثیت رکھتا تھا۔

دوسری جانب کوفہ والوں کے تاثرات بھی اس موقع پر نظر انداز کرنے کے

قابل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک بدقسمتی ہے کہ کوفہ والے عام طور پر غدار دبے وفا ہی مشہور

ہو گئے۔ یہ الزام اس حد تک بس صحیح ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے مقابلہ میں جو فوج تھی وہ

کوفہ کے رہنے والے لوگوں پر مشتمل تھی مگر اسی کوفہ میں زیادہ ایک بڑی جماعت تھی جو شیعیان

کوفہ کے نام سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور یہ لوگ کسی صورت سے واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں

مورد الزام نہیں ہو سکتے۔

اس کی تشریح میں نے "قاتلان حسینؑ کا مذہب" رسالہ میں بھی کی ہے اور "شہید

انسانیت" میں بھی اس کی پوری تشریح کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت سے کوفہ میں ابن زیاد کی سلطنت ہوئی چُن چُن کر

اُن لوگوں کو جن پر ذرا بھی ہمدردی اہلِ بیت کا شبہہ ہو سکتا تھا قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔

یہی وہ کام تھا جسے نعمان بن بشیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جناب مسلم بن عقیل کے وردِ کوفہ کے موقع پر وہ کوفہ کا حاکم تھا اُس نے اعلان کیا کہ میں کسی کے متعلق بدگمانی کی بنا پر کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتا اور نہ بلا وجہ کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنا چاہتا ہوں۔ ہاں اگر کوئی تلوار لے کر کھڑا ہو گا اور حملہ آور ہو گا تو پھر میں بھی جنگ پر مجبور ہو جاؤں گا۔ مگر یہ پالیسی ہوا خواہانِ بنی امیہ کے لیے باعث تسکین نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ نعمان کی شکایت دربارِ خلافت میں ہوئی اور وہاں سے نعمان کو معزول کر کے ابنِ زیاد کو حاکم کوفہ مقرر کیا گیا۔ ابنِ زیاد کو ہدایت یزید کی طرف سے یہی کر دی گئی تھی کہ جس پر کوئی بھی شخص غداری کا الزام عائد کر دے (چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو) اور جس کے متعلق ذرا بھی بدگمانی پیدا ہو جائے اور شبہہ ہو جائے اُس کو بھی گرفتار کر لو۔ کیا ممکن تھا کہ اس حکم کی خلاف ورزی ہوتی۔ چنانچہ جتنے اہلِ بیت کے ہمدرد تھے اور کوئی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ جیل خانوں میں مقید کر دیے گئے۔ کچھ جناب مسلم کی امداد میں یا امداد کے ارادہ کی بنا پر قتل کیے گئے۔ جب حضرت مسلم کی شہادت ہوئی ہے تو مختار کوفہ میں موجود نہ تھے۔ وہ اس کے بعد پہنچے اُس وقت جب عمرو بن حریث نے رایتِ اماں بلند کیا تھا کہ جو اس جھنڈے کے نیچے آجائے وہ اماں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا رایت قتلِ عام کے حکم کے بعد اونچا کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پہلے ہر شخص خطرہ میں تھا

اور کوئی شخص اپنی جان و مال کے لیے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ مختار کو معلوم تھا کہ مجھے آئندہ کی زندگی میں بڑے بڑے کام کرنا ہیں۔ اگر وہ کوفہ میں جناب مسلم کو زندہ پاتے تو وہ یقیناً اُن کی نصرت کرتے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ جناب مسلم شہید ہو چکے ہیں تو اُن کے تدبر نے بتلایا کہ وہ اس راہِ امن کے نیچے چلے آئیں۔ جسے عمرو بن حریث نے بلند کیا تھا مگر ان کے لیے وہاں بھی امن نہ تھا۔ وہ گرفتار کر لیے گئے اور قید کر دیے گئے۔ اتنے لوگ قید خانوں میں ڈالے گئے تھے کہ جن کے بعد حکومت بنی امیہ اطمینان کی سانس لے سکی کہ اب ہمارا مستقبل محفوظ ہو گیا۔

جب یہ عالم ہو گیا تھا کہ جو ملا اُسے قید خانہ میں ڈال دیا تو اس وقت ہر ایک کو فکر تھی کہ کسی طرح سے اپنے کو حکومت کی گرفت سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ جو لوگ گرفتار نہیں ہو سکے۔ اُن میں سے کچھ تہ خانوں میں چھپ گئے۔ کچھ لوگ دیہاتوں میں نکل گئے اور کچھ لوگ جنگلوں کی طرف چلے گئے۔

پھر جب جناب مسلم کی شہادت ہو چکی تو حکومت وقت کی طرف سے یہ انتظام ہوا کہ شہر کی ناکہ بندی ہو جائے اور کوئی شخص کوفہ کے باہر نہ جا سکے۔ اور نہ کوئی شخص کوفہ کے باہر سے اندر آ سکے۔ اس لیے وہ لوگ جو کہ قید خانوں سے باہر تھے اور کوفہ سے نکل جانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اُن کو اطلاعات کا پہنچنا بھی عام طور پر ناممکن ہو گیا۔ اسی طرح کوفہ کے اندر جو لوگ چھپے ہوئے تھے۔ ان کے لیے اس امر سے مطلع ہونے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ امام حسینؑ کوفہ کے قریب آ گئے ہیں۔ اس لیے کہ حضرت نے جو دو قاصد

نکلیچے تھے راستے ہی سے یہ اطلاع دینے کے لیے کہ میں آگیا ہوں۔ عبداللہ بن یقطر اور قیس بن مسہر دونوں راستے ہی میں گرفتار کر کے قتل کر ڈالے گئے تھے۔

معلوم ہوا کہ شیعیان اہل بیت کوفہ میں زیادہ تر قید تھے اور جو موجود تھے وہ بالکل بے خبر تھے۔ جس وقت شہادت امام حسینؑ ہو چکی اور اہل حرم کا قافلہ کوفہ میں پہنچا تو گھروں میں کون لوگ تھے؟ صرف عورتیں اور بچے۔ یہ جن گھروں سے رونے اور پیٹنے کی صدائیں بلند ہوئی تھیں زیادہ تر وہی تھے جن کے مرد یا تو قید خانوں میں قید ہو چکے تھے یا خائف ہو کر دشمن سے منتشر اور پراگندہ ہو چکے تھے۔ رہ گئیں عورتیں، وہ روتی تھیں اور نوحہ کرتی تھیں مگر جب وہ واپس آئے اور وہ اُس وقت کہ جب حکومت کی نظر میں اندیشہ باقی نہ رہا۔ اندیشہ اُس وقت تک تھا جب تک امام حسینؑ شہید نہیں ہوئے تھے اور اہل حرم کوفہ لائے نہیں گئے تھے اور جس وقت حضرت کی شہادت ہوگئی اور اہل حرم کی کوفہ سے روانگی ہوگئی تو پہرے اُٹھا لیے گئے، اور پابندیاں کم کر دی گئیں۔ اجتماعات پر جو پابندیاں تھیں وہ بھی واپس لے لی گئیں۔ اب سوائے خاص آدمیوں کے جو حکومت کی نظر میں ابھی تک خطرناک تھے، عام افراد جو وقتی طور پر صرف بدگمانی اور شبہہ پر گرفتار ہوئے تھے اُن میں سے بہت سوں کو چھوڑ بھی دیا گیا۔ اب جو لوگ گوشوں میں چھپے ہوئے تھے، یا دیہاتوں میں اور جنگلوں میں نکل گئے تھے وہ بھی واپس آئے، اب موقع ملا آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کا۔ اب جو ملاقاتیں ہوئیں آپس میں تو ہر ایک کی زبان پر یہ تھا کہ ارے کیا غضب ہو گیا کہ فرزند رسول ہم سے اتنا قریب شہید ہو گیا اور ہم مدد کے لیے نہ پہنچ سکے۔ پھر اب کیا

کیا جائے۔ طے کیا گیا۔ کہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس محرومی کے دھبے کو دامن پر سے اپنے خون سے دھوئیں اور جس قدر بھی ممکن ہو اُن کے دشمنوں کو قتل کریں یا خود قتل ہو جائیں۔ یہ اُس وقت ہوا جب کہ حکومت کی گرفت ابھی مضبوط تھی اور یزید ہلاک بھی نہ ہوا تھا۔ سلیمان بن صرد خزاعی کی قیادت میں ایک اجتماع ہوا اور ایسی جماعت کی تشکیل ہوئی جو خونِ امامؑ کا بدلہ لینے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اس کا نام ہوا "جماعتِ توابین" اسی نام سے تاریخ اس جماعت کو یاد کرتی ہے۔

یہ میں نے بارہا اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ شہادتِ امام حسینؑ نے عوض اس کے کہ جراتوں کو فنا کرے، اور دلوں میں ولولہ پیدا کر دیا اور ہمت پیدا کر دی ورنہ آپ ملاحظہ کیجیے کہ اُس ظالم حکومت کے دار السلطنت میں جس کے ہاتھوں اتنے مظالم ہو چکے ہوں، کون آدمی اتنی ہمت کر سکتا تھا کہ وہ کوئی اجتماع منعقد کرے اور مقررین وہاں حکومتِ وقت کے خلاف تقریریں کریں۔ یہ حقیقت میں وہ ہمت کی روح تھی جو حسینؑ نے پیدا کر دی تھی۔ چار ہزار آدمی تھے جو سلیمان بن صرد خزاعی کے ساتھ اُٹھے۔ یہ سلیمان صحابۂ پیغمبر میں سے تھے اور جمل، صفین اور نہروان میں امیر المومنین کے ساتھ جہاد میں شریک رہ چکے تھے اور حضرتؑ کی نصرت کر چکے تھے۔ اُن کی عمر اس وقت ستّر اسّی برس کی تھی۔ سب نے طے کیا کہ ہم ان کو افسر بناتے ہیں۔ اگر یہ شہید ہو جائیں تو سالارِ لشکر مسیب بن نجبہ فزاری ہوں گے۔ وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن وال اور اُن کے بعد رفاعہ بن شداد تھے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ہر تقریر میں اُن مظالم کا تذکرہ جو امام حسینؑ پر ہوئے تھے اور پھر ایک دل شکستہ اور مجروح جگر جماعت کا نالۂ و فریاد! ایک وہ جماعت جو امام حسینؑ کو خود بلا چکی اور اس پر نادم ہے کہ افسوس حضرت ہمارے بلانے پر ادھر آئے اور ہم نصرت کو اُن تک نہ پہنچ سکے۔

دیکھیے تو کہ آج تیرہ سو برس کے بعد جب ہمارا دل اس احساس سے بے تاب ہوتا ہے کہ ہم نہ ہوئے تو وہ جماعت جو اُس وقت زندہ تھی اور موجود تھی مگر اسباب کی زنجیروں میں جکڑی رہی اور جو دلولے تھے نصرت کے وہ پورے نہ ہو سکے تو اُس کے غم و اندوہ اور اُس کے مظاہرہ کا کیا عالم ہوگا۔

چنانچہ تاریخ بھی بتلاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک مجمع اور ہر ایک جلسہ جو تدابیر جنگ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوتا تھا وہ ایک انتہائی دردناک مجلس ہوتی تھی جس میں ایک طرف تو عزم جنگ کا اظہار ہوتا تھا اور دوسری طرف حسینؑ کی مصیبت پر گریہ ہوتا تھا۔ اور ہر مقرر اپنی تقریر میں اس غرض سے کہ جن دلوں میں ابھی سچا ولولۂ قربانی نہیں ہے اُن میں ولولۂ قربانی پیدا ہو جائے۔ انصار حسینؑ کے کارنامے بہتر سے بہتر الفاظ میں پیش کرتا اور موثر سے موثر انداز میں ان کا تذکرہ کرتا تھا۔

ان لوگوں نے طے کیا کہ اصلی قاتل امام حسینؑ کا یزید ہے۔ اس لیے ہم کو براہِ راست اُس سے جنگ کرنا چاہیے۔ یہ تو یزید کی سیاست کا بعد کو دعویٰ ہو گیا تھا کہ قاتل میں نہیں ہوں بلکہ ابن زیاد ہے جیسے آج تک بعض ہوا خواہان بنی امیہ یزید کی صفائی میں پیش

کرتے ہیں مگر تاریخ بتلاتی ہے کہ جو سب سے پہلی جماعت خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھی اُس نے سب سے پہلا ذمہ دار قتلِ حسینؑ کا یزید ہی کو قرار دیا۔

اُنھوں نے طے کیا کہ ہماری تعداد کم ہی مگر ہم پہلے دمشق چل کر یزید ہی کا خاتمہ کریں گے چنانچہ سب متفق ہوئے اور تاریخ مقرر ہوگئی کہ فلاں تاریخ ہم سب لوگ نکل کھڑے ہوں گے مگر طے یہ ہوا کہ ذرا میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے چل کر شہدا کے قبور کی زیارت کرلیں۔ ذرا حسینؑ کے سامنے جا کر اپنے دلولۂ قربانی کا اظہار تو کردیں چنانچہ سب متفق ہوئے کہ چلو زیارتِ حسینؑ کو۔ سلیمان بن صرد خزاعی اور اُن کے ساتھ پورا گروہ مجاہدین کا۔ چار ہزار آدمی اُس بے آب و گیاہ جنگل میں جہاں ایک دن کوئی دفن کرنے والا بھی نہ تھا آج اتنا بڑا مجمع پروانوں کی طرح قبر پر گرا پڑتا تھا۔ اُس وقت کی بے تابی اور اُس وقت کا عالم! وہ کربلا جہاں پہنچنے کی حسینؑ کی زندگی میں حسرت تھی وہاں آج پہنچ رہے ہیں جس وقت وہی حسینؑ موجود نہیں۔

جوں ہی کربلا کے قریب آئے سب نے اپنے گھوڑوں پر سے اپنے کو گرادیا۔ بے تابانہ عمامے سروں پر سے اتارے ہوئے تلواریں ہاتھوں میں کھینچے ہوئے۔ سب کے سب قبرِ حسینؑ تک پہنچے۔ ایک رات بھر قبر کے اوپر ایک عالم تھا نالہ و فریاد کا۔ گویا سب کے سب قبرِ حسینؑ کے سامنے کھڑے ہو کر عہدِ جاں بازی اور پیمانِ وفاداری کر رہے تھے کہ مولا اُس وقت نہ پہنچ سکے تو آج حاضر ہیں۔ اُس وقت نہ تھے تو آج جانیں نثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ امام حسینؑ کی قبر سے رخصت ہو کر سب متوجہ ہوئے شام کی طرف۔ جب وہاں خبر پہنچی

تو ان کے مقابلہ کے لیے فوج بھیج گئی۔ وسطِ راہ میں عراق و شام کے عین الوردہ جو مقام ہے اُس میں تصادم ہوا۔ چار ہزار سہی، پھر بھی فوجِ شام کے سامنے بہت کم تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان بن صرد خزاعی شہید ہوئے، اُس کے بعد مسیب شہید ہوئے اور پھر عبداللہ بن وال شہید ہو گئے۔ چار ہزار میں سے تین ہزار سات سو آدمی تین دن میں شہید ہو گئے۔ صرف تین سو آدمی رہ گئے تھے جن میں کچھ زخمی تھے، کچھ جنگ سے بے کار ہو چکے تھے۔ جن کو رفاعہ بن شداد اپنے ساتھ واپس لے گئے اور پھر یہ لوگ مختار کے ساتھ قاتلانِ امام حسینؑ سے بدلا لینے میں شریک ہوئے۔

اس جماعتِ توابین نے غمِ سیدالشہداء کی جو روح افراد کے دلوں میں پھونک دی وہ فنا ہونے والی نہیں تھی۔ اس جماعت نے اپنے طرز پر عزاداری کی ابتدا کی اور کوئی شک نہیں اس میں کہ یہ چار ہزار کا لشکر جس وقت کہ قبرِ امام حسینؑ کے اوپر تھا تو دور دور کے لوگ اس سے مطلع ہو رہے تھے اور سب پر شہادتِ امام حسینؑ اور اُس کے غم کا اثر ہو رہا تھا۔

اُس کے بعد جب مختار نے خونِ حسینؑ کے انتقام کا ارادہ کیا تو اُنھوں نے اپنی جماعت کے ساتھ یہ طے کیا کہ ہم کو شام جانے کی کیا ضرورت ہے مقصد ایک ہی ہے۔ وہ اتنا بدلا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ براہِ راست قاتل تو ہمارے گھروں کے پاس ہیں اور اسی شہر میں موجود ہیں۔ ہم کو یہیں رہ کر امام حسینؑ کے قاتلوں کو قتل کرنا چاہیے۔ چنانچہ سب نے متفق ہو کر امام حسینؑ کے قاتلوں کو چن چن کر سزا دینا شروع کی۔ اس کا بھی عجیب انداز تھا۔ ظالم آیا تو دربار مجلسِ غم بن گیا۔ کیوں کہ ہر ایک ظالم کے گرفتار ہو کر آنے پر اُس کے ظلم کا تذکرہ

ہوتا تھا۔ اس طرح کہ اس سے پوچھا جاتا تھا کہ تو نے کربلا میں کیا کیا تھا اور ہر ایک ظالم خود اپنے مظالم کا تذکرہ کرتا تھا۔ اب آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ ایک ایسے اجتماع میں جہاں محبانِ اہلِ بیت جمع ہوں خود قاتل مظالم کا تذکرہ کر رہا ہو تو کیا صبر و سکوت قائم رہ سکتا ہے۔ آج اُن واقعات کا جو راویوں کے ذریعہ سے پہنچتے ہیں تذکرہ ہمارے لیے سبب بے تابی ہوتا ہے، چہ جائیکہ بذاتِ خود مظالم کا ارتکاب کرنے والا اُن واقعات کا تذکرہ کر رہا ہو تو اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ایک دربار ایک مجلس ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ دور دراز کے مقامات پر جو شہید کیے گئے تھے جیسے سلیمان بن صرد خزاعی یا مسیب یا عبداللہ بن وال۔ اُن کے واقعات ممکن ہے شہرت کے درجہ تک نہ پہنچے ہوں کیونکہ وہ ایک مظلومانہ شان سے شہادت پا گئے مگر اب تو مختار کا دور ایسا نہ تھا کہ جس کا تذکرہ دور دراز کے مقامات تک نہ پہنچا ہو کیونکہ انھوں نے وقتی طور پر اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ صرف کوفہ ہی میں نہیں بلکہ اطراف کوفہ میں دور دور کے مقامات پر انھوں نے تسلط حاصل کر لیا تھا اور اپنے عمال ہر جگہ مقرر کر دیے تھے۔ ان صورتوں میں یہ ناممکن تھا کہ اس کی اطلاع ایک محدود حلقہ میں رہے۔ خصوصاً جب کہ ایسے لوگ جن کو اہل بیت کے ساتھ کچھ بھی ہمدردی ہو سکتی تھی۔ سب واقعات معلوم کرنے کے لیے بہت مضطرب تھے اور جو امام حسینؑ کے پس ماندگان تھے انھیں سب سے زیادہ واقعات کے معلوم کرنے کا اشتیاق ہی رہتا تھا کہ آج مختار نے کیا کیا اور آج کیا کیا۔ خود امام زین العابدینؑ جو آتا تھا اس سے پوچھتے تھے کہ کہو مختار کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ ایک شخص

اور حضرت سے واقعات مختار کے بیان کرنا شروع کیے۔ حضرت نے دریافت کیا کہ کیو حرملہ قاتل جناب علی اصغر بھی گرفتار ہوا۔ اُس نے بیان کیا کہ جب تک میں کوفہ سے چلا ہوں اُس وقت تک تو وہ گرفتار نہیں ہوا تھا۔ حضرت نے ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں کہا اَللّٰھُمَّ اَذِقہُ حَرَّ النَّار "خداوندا اُس کو آگ کا مزہ چکھا دے"۔ ظاہر ہے کہ جب قبل گرفتاری وقتل حرملہ کے انجام کے متعلق حضرت کو جستجو تھی تو جب وہ گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا تو امام نے اس خبر کو سُن کر اپنے تاثرات کس طرح ظاہر نہ فرمائے ہوں گے۔

حقیقت میں مختار کے اس دورِ زندگی کا ہر لمحہ امام حسینؑ کی یاد کو نہ صرف کوفہ میں بلکہ دُور دراز کے مقامات پر پہنچانے میں صرف ہوا۔

اس کے بعد امام حسینؑ کا تذکرہ اور آپ کا غم اتنا مؤثر حربہ سمجھ لیا گیا کہ جو حقیقی ہمدرد اہلبیت کے نہ تھے اور اُن کو حکومت بنی امیہ سے مقابلہ کرنا ہوا تو وہ بھی اسی حربہ کو لے کر سامنے آئے۔ چنانچہ بنی عباس کی سلطنت کی داغ بیل اسی بنیاد پر پڑی۔ ان کو اہل بیت رسول کے ساتھ اصلی معنوں میں ہمدردی کبھی بھی نہیں تھی۔ مگر کون مسلمانوں کو ٹھکرا کر سکتا تھا اولاد عباس کے نام سے یہ صرف آلِ محمدؐ کے نام پر مسلمان کھڑے کیے گئے۔ اور غم حسینؑ کو اپنا لباس بنایا گیا۔ سیاہ پوشی مستقل طور پر اپنے قومی لباس کی صورت سے اختیار کی گئی۔ غم حسینؑ کے اعلان کے طور پر فوج کے تمام جھنڈے سیاہ دیکھے گئے۔ سب سے پہلے جو جھنڈا بلند کیا گیا وہ عاشور کے دن دسویں محرم کو ایران میں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ائمہ معصومین جانتے تھے کہ اس کا باطن

ہمدردی میں کس طرح نفسانیت شریک ہے۔

یقیناً اگر کوئی جذبات کی رو میں بہنے والا انسان ہوتا تو وہ ان افراد کے فریب کا شکار ہو جاتا مگر وہ ایمہ معصومینؑ تھے کہ جو ہر ایک چیز سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے وہ ان ظاہری ہمدردیوں کے دھوکے میں نہیں آئے اور انھوں نے اپنے ساتھ والوں کو اس جماعت میں داخل ہونے سے روکا یہاں تک کہ سیاہ لباس کی مذمت میں حدیثیں وارد ہوگئیں اور علویین میں جس کسی نے کبھی سیاہ لباس پہنا تو اُس کے اوپر ایک بڑا الزام عائد ہوگیا تاریخ اُس کا ایک جرم بنا کر لکھتی ہے کہ وہ پہلا شخص تھا علویین میں سے جس نے سیاہ کپڑے پہنے اور حکم شرعی میں آپ کو معلوم ہے کہ سوائے عمامہ، موزہ اور عبا کے تمام قسم کے سیاہ لباس کو شرع نے مکروہ قرار دے دیا ہے۔

اس طرح سے لوگوں کو اُن کا ساتھ دینے سے روکا۔ پھر بھی ان کے ہاتھوں اہل بیت کا یہ مقصد تو پورا ہو تا گیا کہ حسینؑ کی یاد دنیا میں پھیلتی جائے۔ امام حسینؑ سے ہمدردی اور اُن کے قاتلوں سے نفرت یہ چیز ہر ایک کے دل میں راسخ ہوگئی۔

ابو العباس سفاح جو سب سے پہلا خلیفہ بنی عباس کا تھا اُس نے بنی امیہ پر جو کچھ سختیاں ہو سکتی تھیں کیں اور سند جواز یہی قرار دی کہ امام حسینؑ پر جو مظالم ہوئے اُن کا ہم بدلا لے رہے ہیں۔

اس اعلان میں کوئی حقانیت نہیں تھی مگر نتیجہ تو اس سے وہی پیدا ہوا کہ بنی امیہ سے نفرت پیدا ہوئی اور آلِ رسول سے دنیا کو ہمدردی پیدا ہوگئی۔

یہ اور بات ہے کہ بنی عباس کا یہ رویہ چونکہ سیاسی مصالح پر مبنی تھا اس لیے وہ وقتی ثابت ہوا اور سیاست کے بدلنے کے ساتھ اُن کوششوں کا رنگ بھی بدل گیا۔ اُنھوں نے آلِ محمدؐ کے نام پر دنیا کو ہم خیال بنایا مگر ایک وقت وہ آیا کہ اُنھی کے ہاتھوں آلِ محمدؐ چُن چُن کر قید ہوئے بلکہ قصرِ حکومت کی دیواروں میں اولادِ رسولؐ کے خون کا گارا لگایا گیا جو بنی امیہ نے بھی نہیں کیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حسینؑ مظلوم کی قبر کو بھی کھودنے کی کوششیں ہوئیں۔

اسی بنا پر ایک شاعر نے کہا :۔

تاللہ ان کانت امیۃ قد اتت قتل ابن بنت نبیھا مظلوما
فلقد اتاہ بنو ابیہ بمثلہ ھذا لعمری قبرہ مھدوما

(یعنی) بنی امیہ نے اگر اپنے نبی کے نواسے کو ظلم و ستم کے ساتھ قتل کیا تو یہ بنی عباس جو اُن کے ساتھ خاندانی قرابت کے بھی مدعی ہیں اُنھوں نے اُن کی قبر کو بھی برقرار نہ رہنے دیا بلکہ اُس کی عمارت کو منہدم کر دیا۔

خیر یہ تبدیلی اُن کی سیاست میں اُن کی بدنیتی کو دیکھتے ہوئے ہونا چاہیے ہی تھی جو ہوئی مگر اُن کی اُس پہلی سیاست کے نتیجہ میں جن جن دلوں پر آلِ محمدؐ کا اثر قائم ہو گیا تھا وہ تو دائمی طور پر باقی رہا اور نتیجہ میں وہی اثر خود بنی عباس کے خلاف بھی اُن کی دوسری سیاست کے موقع پر کارگر ثابت ہوا جس کو نہ حکومت بنی عباس فنا کر سکی اور نہ پھر دنیا کی کوئی دوسری طاقت فنا کرنے میں کامیاب ہوئی۔

جو انصار امام حسینؑ کے ساتھ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اُن کے قوم و قبیلہ کا تنوع
واختلاف بھی واقعۂ کربلا کے ہمہ گیر اثر پھیلانے کا بہت بڑا سبب بنا۔ یعنی امام حسینؑ کے
ساتھ اگر صرف بنی ہاشم ہوتے تو اعتقادی طور پر اس کا اثر بہت اہم ہو سکتا تھا مگر مادّی
اسباب کی بنا پر اس کا تعلق ہر قوم، قبیلہ اور جماعت سے پیدا نہ ہوتا لیکن انصارِ حسینؑ کی
فہرست پر نظر جو ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قبائلِ عرب کے جو ممتاز افراد ہو سکتے تھے
تقریباً سب وہ حضرتؑ کی نصرت میں مصروفِ جہاد تھے یعنی ظاہر میں تو مخالف جماعت کے
تیس ہزار افراد تھے مگر وہ تیس ہزار عوام اور جاہلِ عرب تھے جن کا کوئی وزن نہ تھا اور یہ
بہتّر آدمی تھے لیکن ہر ایک ان میں سے اپنے قوم و قبیلہ کا دل اور دماغ سمجھا جا سکتا تھا
امام حسینؑ نے عوام کو اپنے ساتھ نہیں لیا تھا بلکہ جو حضرتؑ کی نصرت کو آئے تھے وہ رفیع
درجہ رکھتے تھے اُن میں سے بہت سے عابد، شب زندہ دار، بہت سے حافظِ قرآن
اور بہت سے راویانِ احادیث تھے۔ یہ امام حسینؑ کی نصرت سے پہلے بھی اپنی اپنی جماعت
میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک مستقل شخصیت کا حامل تھا جس کا درجہ
دشمن پر اُس وقت بھی اثر پڑ رہا تھا اور بعد میں بھی جو سنتا تھا اُس پر اثر پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ چونکہ تقریباً ہر ایک قبیلہ کے ایک یا کئی ممتاز افراد حضرت سیدالشہداء
کے ساتھ تھے مثلاً قبیلۂ اسد کے کئی آدمی، قبیلۂ ہمدان کے متعدد افراد، قبیلۂ خزاعہ، قبیلۂ
سعد اور اسی طرح قبیلۂ بجیلہ، قبیلۂ خثعم، قبیلۂ تغلب، قبیلۂ جعف وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو
میں نے سرسری طور پر چند قبیلوں کا نام لے دیا ہے۔ اصحابِ حسینؑ کے موضوع پر جو تقریریں میں نے

آج سے تین برس قبل ریڈیو پر کی تھی۔ اُس میں میں نے پوری فہرست بیان کی تھی کہ کس کس قبیلہ کے کون کون لوگ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ تھے۔ اب مذہبی خصوصیت کو جانے دیجیے۔ اگر صرف حمیت عرب اور اُس قبیلہ پروری کے لحاظ سے دیکھا جائے جو عرب کی فطرت تھی جن کا اُصول یہ تھا کہ اپنے قبیلہ والے کی حمایت کرو خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔ تو جب ایسے ایسے ممتاز افراد ہر قبیلہ کے سید الشہداؑ کے ساتھ تھے اور اُن کی شہادت ابن زیاد کی فوج کے ہاتھ سے ہوئی تو ہر ایک قبیلہ میں اُس کے اثرات پہنچنا لازمی تھے اور کم از کم ہر قبیلہ اور ہر جگہ کے لوگ یہ دریافت کرنے پر مجبور تھے کہ ایسے ایسے اتقیائے روزگار اور عابدان شب زندہ دار کس وجہ سے قتل کیے گئے۔ اس طرح تمام قبائل عرب میں واقعۂ کربلا کے اسباب اور حالات کا تذکرہ ہونا لازمی بات تھی۔

پھر وہ تو کوفہ کا ذکر میں نے کیا تھا کہ وہاں اہلبیت کے دوست قید ہو گئے تھے لیکن دوسرے مقامات پر بہت سے لوگ ایسے تھے جو سمجھتے تھے کہ ابھی وقت نصرت کا دور ہے اور اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ دسویں محرم سنہ ۶۱ھ وہ تاریخ ہے جس میں ہماری امداد ضروری ہے اُن کو یہ خبریں پہنچی تھیں کہ امام حسینؑ نے بیعت نہیں کی ہے تو وہ دل میں یہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ جب حضرت علم جہاد بلند کریں گے تب ہم امام کے ساتھ جہاد میں شریک ہوں گے اور اُن کے دشمنوں سے جنگ کریں گے مگر کربلا میں امام حسینؑ کا پہنچنا اور پھر روز عاشور جنگ کا قطعی ہو جانا بالکل ہنگامی امر تھا۔

نویں محرم کی سہ پہر تک خود عمر سعد کو نہیں معلوم تھا کہ حقیقتہً لڑائی ہوگی۔ اس نے اس وقت تک صلح کی گفتگو کی تھی۔ یہ تو نویں کی سہ پہر ہی کو خط آیا جس میں لکھا تھا کہ تم کو اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے کہ تم حسینؑ سے صلح کی گفتگو میں کرو یا نجات کی امیدیں دلاؤ۔ تم کو تو بس قطعی سوال پیش کرنا ہے کہ یا تو وہ اطاعت کریں یا پھر اُن سے جنگ کی جائے۔ یہ خط تھا جس کے بعد اُس نے امام حسینؑ سے گفتگو بیکار سمجھی اور حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ خود امام کو تعجب ہوا کہ یہ بے وقت حملہ کیا۔ کہاں تو ابھی صلح کی گفتگو ہو رہی تھی اور کہاں اس کے بعد ہی اعلان جنگ کیے بغیر ایک دم حملہ! اور اسی بنا پر حضرت نے اپنے بھائی جناب عباس کو بھیجا کہ آخر اس حملہ کا کیا سبب ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ خط آیا ہے اور یوں حکم دیا گیا ہے اس لیے حملہ کیا گیا۔

حُر کو جو فوجِ عمر سعد کا ایک ذمہ دار افسر تھا، صبح عاشور تک یہ نہیں معلوم تھا کہ واقعی جنگ ہوگی۔ چنانچہ اُس نے دسویں تاریخ صبح کو سالارِ فوج عمر سعد سے جو گفتگو کی وہ یہی تھی کہ اُس سے پوچھا کیا تم واقعی ان سے جنگ کرو گے؟ اُس نے کہا ہاں۔ ایسی جنگ کہ سر قلم ہو رہے ہوں اور ہاتھ کٹ کٹ کر زمین پر گرتے ہوں۔ حُر نے کہا یہ اتنی شرطیں جو حسینؑ نے پیش کیں کیا ان میں سے کوئی منظوری کے قابل نہیں۔ اُس نے کہا میں کیا کروں۔ تمھارا حاکم نہیں مانتا یعنی ابنِ زیاد قبول نہیں کرتا۔

معلوم ہوا کہ کربلا کی جنگ جس موقع پر ہوئی، کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ تاریخ جنگ کیا ہوگی، موقع جنگ کیا ہوگا اور صورت جنگ کیا ہوگی۔ جس غیر معین طریقہ پر

جنگ ہوئی اُس کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے جتنے پہنچ گئے نصرت حسینؑ کے لیے اُن کی خوش نصیبی تھی اور طاقت عمل۔ اور جو نہ پہنچے اُن میں سے کچھ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ طاقت عمل کی کمزوری تھی، کچھ کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ قوت ارادی کا ضعف تھا اور بہت سوں کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ صرف بدنصیبی تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ علم اسباب کی بنار پر ان حالات میں اگر صرف دس بیس مددگار بھی پہنچ جاتے امام حسینؑ کے پاس تو یہ کمی حیرت انگیز بات نہ تھی۔ برخلاف اس کے جتنے افراد امام حسینؑ کے پاس ان ہنگامی حالات میں پہنچ گئے وہ سو سے زیادہ تھے اور وہ ایسے تھے کہ جیسے حسینؑ چاہتے تھے تو اگر موقع ملتا اور راستہ کھلا ہوتا اطلاع ہوتی سب کو اور پہنچنے کی صورتیں پیدا ہو جاتیں تو کتنے لوگ پہنچ جاتے۔

اب وہ تمام لوگ جو نہ پہنچ سکے۔ اُن کے دل پر نہ پہنچنے کا یقیناً ایک داغ ہو گیا اور چونکہ بنی امیہ سے نفرت اُن کے دل میں بھی اُتنی ہی تھی جتنی انصار سید الشہداء کے دل میں ہو سکتی تھی اس لیے اُن کا اس کے بعد مظالم بنی امیہ کے اظہار میں مصروف ہو جانا ایک فطری امر تھا۔

جو پہنچ گئے اور اپنی جانیں دے دیں وہ تو حقیقۃً خوش دل گئے۔ غم تو اُن کو رہا جو نہیں پہنچے۔ غم تو اُن ہی کو ہے جو نصرت نہ کر سکے۔

اگر ہوتے اور نصرت کرتے تو جیسے مسلم بن عوسجہ ہنستے ہوئے دنیا سے گئے ہم بھی ہنستے ہی رہتے۔ رونا کاہے کا ہوتا۔ رونے کی ضرورت اس بنار پر پیدا ہوئی کہ اُس دن موجود نہ تھے۔

بلکہ اسی کا رونا ہمارے ائمہ کو رہا اور اسی کا رونا تمام محبت رکھنے والوں کو رہا۔

بہرحال جتنے لوگ اس وقت موجود تھے، کہیں بھی ہوں۔ بصرہ میں ہوں یا طائف میں ہوں یا یمین میں ہوں یا ایران میں، کسی جگہ بھی عالم اسلامی میں وہ لوگ موجود ہوں، جن کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر ہم کو اطلاع ہو جاتی اور ہم پہنچتے تو اپنا خون بہاتے، انھیں اب جو واقعات کی اطلاع پہنچی تو وہ آنسو بہانے لگے اور اس طرح جتنے ممالک اسلامیہ تھے سب میں ایک عام اثر غم و اندوہ کا پیدا ہو گیا۔

روایتیں دونوں فریق کے یہاں موجود ہیں، ہمارے یہاں بھی اور اہل سنت کے یہاں بھی کہ بعد شہادت حسینؑ سورج کو گہن لگا۔ دنیا میں تاریکی چھا گئی۔ آسمان سے خون برسا اور تین دن تک برستا رہا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ چالیس دن تک خون برسا۔

ہم تو بہرحال اس کو یقین کرنے پر مجبور ہیں اور اس کے متعلق روایات ماننے کو تیار ہیں کہ ماننا پڑے گا لیکن وہ غیر مسلم لوگ جو روایات کی بنا پر اس واقعہ کو تسلیم کرنے پر مجبور رہتے ہیں۔ انھیں اس سے ایک اندازہ تو ضرور ہو سکتا ہے، ہر ایک مذہب میں جو اس مذہب کا سب سے بڑا انسان تھا۔ اس کے حادثۂ رحلت پر اس طرح کے روایات پائے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کے یہاں حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے موقع پر بائبل میں یہی ہے کہ تین دن تک عالم میں سیاہی چھائی رہی۔ اسی طرح ہر ایک مذہب میں جو اس مذہب کا سب سے بڑا انسان تھا اس کی موت کے موقع پر جو ان کے نزدیک سب سے بڑی مصیبت تھی اس طرح کے روایات پائے جاتے ہیں۔

مسلمان بحیثیت اعتقاد سب سے زیادہ بزرگ پیغمبر اسلام کی ہستی کو مانتے ہیں لیکن پیغمبرؐ کی وفات میں مسلمانوں کے کسی فرقے کے یہاں اس طرح کی چیزیں نہیں وارد ہیں جیسی امام حسینؑ کی شہادت میں وارد ہیں۔ اس سے ہر ایک مذہب وملت کے انسان کو یہ اندازہ لگانا پڑے گا کہ بحیثیت مصیبت مسلمانوں کے نزدیک حضرت امام حسینؑ کی شہادت تمام مصائب میں سب سے زیادہ عظیم تھی اور اس شہادت کا اثر اتنا ہمہ گیر صورت سے مسلمانوں پر ہوا جیسا کسی حادثہ کا اثر اسلامی تاریخ میں نہیں پیدا ہوا۔

ان انقلابات اور عالم کائنات کے اس تاثر کا جو حادثہ کربلا پر پیدا ہوا۔ یا کم از کم نہ ماننے والے کے خیال کے مطابق ان روایات کی شہرت کا عام اثر کیا ہو سکتا تھا؟ یہی کہ ہر انسان یہ محسوس کرے کہ جس پر آسمان رو دیا کیا ہم اُس پر گریہ نہ کریں؟ جس پر آسمان نے خون بہایا کیا ہم اُس پر آنسو بھی نہ بہائیں؟

اس سے یہ خوب اندازہ ہو سکتا ہے کہ تمام عالم اسلامی پر امام حسینؑ کی شہادت کا کیا اثر ہوا۔ وہ اثر ہرگز خوشی کی صورت میں تو نہیں تھا۔ یہ تو ایک مصنوعی بات ہے جو اب بنائی گئی ہے کہ چونکہ امام حسینؑ کو شہادت کا درجہ حاصل ہوا۔ اس لیے اس پر خوشی کرو۔ مگر جو فطری اثر پڑا بروقت وقوعِ واقعہ وہ تو غم ہی کا تھا۔

اگر خوشی کی حکایتیں اب تصنیف کر لی جائیں تو اور بات ہے مگر جہاں تک فطرت خود مصروفِ عمل رہی، اندوہ و مصیبت کا احساس ہی تھا جو چھاتا رہا۔

عزاداری کا دوسرا دور

مظالم کربلا کے اختتام کے بعد ائمہ اہل بیت جو خاموشی کے ساتھ دینِ خدا کی حفاظت کرتے رہے، وہ جانتے تھے کہ دینِ اسلام کے لیے امام حسینؑ نے جو قربانی کی ہے وہ اپنے وقت پر ایک کامیاب قربانی تھی جس سے حسینؑ نے بنائے لا الٰہ الا اللہ کو قائم رکھ لیا۔ مگر یہ مقصد اور اس کی کامیابی اس کے بعد اسی وقت تک باقی اور برقرار رہ سکتی ہے جب تک کہ اس قربانی کی یاد زندہ ہے۔ اگر دنیا اس قربانی کو بھول گئی تو پھر امام حسینؑ کی قربانی آئندہ کے لحاظ سے رائگاں چلی جائے گی بلکہ ان کو یہ احساس تھا کہ امام حسینؑ اہلِ حرم کو اپنے ساتھ اس لیے لائے تھے کہ ان کی شہادت کے بعد ان کا تذکرہ تا وقت دنیا تک پہنچ جائے۔ تو جو افراد ساتھ تھے ان سے خود امام حسینؑ نے یہ کام لیا تھا، ہم ان کے جانشین ہیں تو ہم کو خود ان کے اس کام کو جاری رکھنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کام کو امام حسینؑ نے شروع کیا تھا، ائمہ میں سے ہر ایک فرد اس کی تکمیل کی اپنے کو ذمہ دار سمجھتی تھی۔ ان میں سے دو بزرگوار امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ خود مصیبت کربلا میں شریک تھے۔ امام زین العابدینؑ بیمار اور امام محمد باقرؑ بہت کمسن۔ جہاں جہاں اہلِ حرم گئے، وہاں وہاں یہ بچہ بھی تھا۔

امام زین العابدینؑ اگر عمر بھر روتے رہے تو کیا تعجب۔ ان کے دل پر جو اثر تھا وہ دنیا میں کسی فرد پر ہو ہی نہیں سکتا اور نہ اس کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ روایات آنسوؤں کو بتا سکتے ہیں، گریہ کی کیفیت کو بتا سکتے ہیں۔ لیکن قلبی تاثرات کو نہیں بتا سکتے۔ ہم کو تو

اس کا غم ہے کہ ہم تنتے کیوں نہیں اور اُنھیں اس کا غم تھا کہ میں تنہا اور نصرت نہ کرسکا۔ مگر اُن کو زندگی بھر موقع نہیں ملا۔ اپنے حقیقی تاثرات کے اظہار کا کیوں کہ آپ کی زندگی بڑے پُر آشوب دور سے گزر رہی تھی۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ قید خانہ چند روز کا تھا جو رہائی کے بعد ختم ہوگیا۔ لیکن امام کی پوری زندگی اپنے حقیقی فرائض کو کھل کر اظہار نہ کرسکنے کے لحاظ سے ایک قید خانہ میں رہی۔ تو ان کو کہاں اس کا موقع مل سکتا تھا کہ وہ لوگوں کو ذکرِ حسینؑ کی مجلسیں برپا کرنے کی تلقین کریں۔ ایک مشہور روایت ہے جو کوئی تاریخی حیثیت تو نہیں رکھتی مگر دل کہتا ہے کہ صحیح ہوگی کہ ایک مرتبہ زہری نے امام سے تقریبِ شادی میں شرکت کا وعدہ لیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو جب سے میرے پدرِ بزرگوار شہید ہوئے ہیں اُس وقت سے کسی خوشی کی تقریب میں شرکت نہیں کرتا۔ یہ زہری عام مسلمانوں میں بڑی شخصیت اور علمی امتیاز کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ امام نے موقع پاکر اُن سے صرف اپنا ایک انفرادی عمل ظاہر کردیا۔ اُس وقت ایسا زمانہ نہیں تھا کہ امام دوسرے سے کہیں کہ تم غم کرو۔ زہری نے کہا کہ اگر آپ شرکت فرمائیں تو میں آپ کے پدرِ بزرگوار کی مجلسِ غم برپا کرادوں گا۔ اب امام جیسے خوش ہوگئے۔ فرمایا ہاں اگر ایسا ہوگا تو میں ضرور شریک ہوں گا۔ چنانچہ جب مجلس ہوئی اور امام نے شرکت فرمائی تو آگے مشہور روایت میں یہ ہے کہ زہری نے تو حضرت کو صدر میں بٹھایا تھا مگر جب مجلس ختم ہوئی تو دیکھا گیا کہ حضرت پائیں مجلس تھے، جب پوچھا کہ یہ کیا؟ تو حضرت نے فرمایا، تم کیا جانو اس مجلس میں کون کون شریک ہیں؟ اور وہ بھی میری طرح خدمت اہل مجلس میں مصروف ہیں۔

یہ تو امام زین العابدین کا زمانہ تھا۔ وہ فرائض امامت صرف اپنے خاموش عمل سے انجام دیا کرتے تھے اُن کو اس کا موقع نہ تھا کہ درس گاہ علم قائم ہو۔ طلاب علوم آکر استفادہ کریں۔

ہاں ان تمام مصائب اور غم واندوہ کے تاثرات کے باوجود امام محراب عبادت میں تصویر رسالت پیش کرتے تھے۔ اپنے پدر بزرگوار پر اتنا گریہ کرنے کے باوجود پھر بھی عبادت خدا اتنی کی کہ "زین العابدین" اور "سید الساجدین" کا لقب آپ سے مخصوص ہو گیا۔

وہ دکھلا رہے تھے کہ ہم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو جلال الٰہی سامنے آجاتا ہے جتنی مصیبتیں ہوں، سب کو بھول جاتے ہیں۔

یہ تو انھی کا کام تھا۔ عام طور پر اگر انسانی فکر اور انسانی دماغ کسی ایک فکر میں غرق ہو جاتا ہے تو دوسری فکر کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ وہ انسان تھے جو حقیقت میں اپنے نفس پر قابو رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو فتح کیے ہوئے تھے۔

اُن کی آنکھوں میں یوں تو کربلا کی وہ تصویر پھرا کرتی تھی جسے وہ خود دیکھ چکے تھے اور اُس پر اتنا متاثر تھے کہ دنیا گواہی دیتی ہے کہ ان سے بڑھ کر گریہ کرنے والا ہوا نہیں لیکن جب وقت نماز کا وقت آیا اور وضو کے لیے پانی سامنے آگیا تو وہی فکر جو اس آنکھ سے دیکھے ہوئے قیامت خیز مناظر میں اتنی غرق تھی، اپنے خالق کے جلال میں اتنی مستغرق ہو جاتی ہے کہ اپنے غم کا تصور نہیں باقی رہتا۔ یہ عملی طور پر قدرت

امامت کا اظہار تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام کے عمل کی کیا شان ہونا چاہیے۔

اس کے بعد امام محمد باقرؑ۔ یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ وہ باپ کے ساتھ کربلا کے قیدیوں میں تھے۔ دربار یزید کے حالات میں طبری نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس میں نام دوسرا لکھا ہے مگر احتمال ہے کہ امام محمد باقرؑ ہی ہوں۔ صاحبزادہ کھڑا ہوا تھا کہ یزید کا ایک لڑکا کھیلتا ہوا آ گیا۔ یزید نے صاحبزادہ کی طرف رُخ کر کے کہا کہ کیوں! اس کے ساتھ کشتی لڑو گے؟ صاحبزادہ نے کہا کشتی تو نہیں۔ ہاں ایک تلوار اسے دے دو اور ایک تلوار مجھے دے دو اور اس کے بعد دیکھو کہ کون غالب ہوتا ہے اور کون مغلوب؟

یزید نے کہا شنشنۃ اعرفھا من اخزم الحیّۃ لاتلد الا الحیۃ مطلب یہ ہوا کہ موروثی بات جا نہیں سکتی۔ جو جیسا ہوتا ہے اس کی اولاد بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔

غرض یہ کہ امام محمد باقرؑ برابر سے کربلا کے مصائب میں ساتھ تھے۔ بچپن کا زمانہ سہی لیکن باتیں تو ہمیشہ یاد رہیں اور احساس یہ رہا کہ ہم اُن افراد میں داخل تھے جن پر حسینؑ بھروسا کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔

اگر امام حسینؑ زیادہ برس کا سن رکھتے تھے مگر پیغمبرؐ کے ساتھ مباہلہ میں آئے تو یہ احساس عمر بھر رہا کہ رسولؐ نے ہمیں اپنے کاندھوں پر ایک بار ڈالا ہے اور جب موقع آئے تو میں نصرتِ اسلام کروں اور اپنے عمل سے ثبوت دوں کہ میں اس سبق کو بھولا نہیں ہوں تو اسی صورت سے امام محمد باقرؑ تقریباً اسی سن میں امام حسینؑ کے ساتھ گئے تھے۔ بات یکساں ہے۔ وہ نانا کے ساتھ آئے اور یہ دادا کے ساتھ آ رہے ہیں۔ وہ اپنے ماں اور باپ کے

ساتھ تھے اور یہ اپنے والدین کے ساتھ تھے۔ تو کیا یہ ممکن تھا کہ یہ اپنی عمر میں بھول جائیں اس بات کو کہ امام حسینؑ مجھے بھی لائے تھے اُس عظیم جہاد میں جو کربلا کے میدان میں درپیش تھا۔

اس لیے جس غرض سے امام حسینؑ ان سب کو لے گئے تھے اپنے ساتھ کہ یہ میرے بعد واقعۂ کربلا کی رُوداد ان تک پہنچائیں جو اب تک بے خبر ہیں۔ اس مقصد کو ہر ایک اپنی زندگی میں نباہ گیا اور غیر ممکن تھا کہ امام محمد باقرؑ جو کہ ہر ہر موقع پر ساتھ تھے اس مقصد کو فنا کر دیتے۔ چنانچہ آپ نے جس طرح علوم آل محمد کی اشاعت کی، اُسی طرح غم حسینؑ کی اہمیت، حادثۂ کربلا کی عظمت اور امام حسینؑ کی شخصیت کو بھی دنیا کے سامنے پیش کیا اور اب یہ ہونے لگا کہ یہ خود پوچھنے لگے کہ تم میرے جدِ بزرگوار حسینؑ کو یاد بھی کرتے ہو۔ دیکھیے! مسلک کے متحد ہونے کے ساتھ اسباب و حالات کے موافق عمل کی ترقی امام زین العابدینؑ خود کچھ نہیں سکتے تھے تو اپنا عمل پیش کرتے تھے اور امام محمد باقرؑ اب دور زمانہ ہے کہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرتے ہیں اور زبان سے دعوت بھی دیتے ہیں۔ اب احادیث فضائل گریہ بھی وارد ہوتے ہیں، ترغیب و تحریص بھی ہوتی ہے، بلا بلا کر شاعروں کو ذکرِ مصائب سید الشہدا بھی ہوتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کا زمانہ وہ تھا کہ جب بنی امیہ کی سلطنت ختم ہو رہی تھی اور اُس کے ارکان متزلزل تھے۔ اور ایسے اسباب پیدا ہوئے تھے کہ بنی ہاشم کی طرف اقتدار منتقل ہو بنی عباس نے اُس ہمدردی کو جو تمام مسلمانوں کے دل میں واقعۂ کربلا کے بعد اہل بیت

رسول کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی آلہ کار بنا کر "الرضا لآل محمدؐ" کا علم بلند کیا یعنی ہم پسند کرتے ہیں اہل بیت رسول کو، اور اس لیے لباس سیاہ اختیار کیا گیا، جھنڈا سیاہ رکھا گیا اور عاشور کے دن وہ جھنڈا ایران کی سرزمین پر بلند ہوا اور اس طرح بنی امیہ کی سلطنت ختم ہوئی اور بنی عباس تخت سلطنت پر بیٹھے جن کا پہلا خلیفہ ابوالعباس سفاح وہ تھا کہ جس نے بنی امیہ کے باقی ماندہ افراد کو نیست و نابود کیا اور ایک نشست میں ان میں کے کئی ہزار آدمی قتل کیے اور شاید اسی لیے لقب ہو گیا "سفاح" یعنی خونریزی کرنے والا۔

اگرچہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ اقدامات صحیح نیت سے نہیں تھے اور نہ صحیح حدود میں مقید تھے، اس لیے جو حقیقی آل رسول تھے انھوں نے ان شورشوں اور ہنگاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اور ان لوگوں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ مگر اس کا نتیجہ تو یہ ہوا کہ اب لوگوں کو کھل کر واقعہ کربلا کے متعلق اپنے تاثرات کے اظہار کا موقع مل گیا۔ چنانچہ ایسے شعرا پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنا موضوعِ سخن ہی مدح اہل بیت کو قرار دے دیا۔ اس سے پہلے اگرچہ پہلے دور میں ابتدا ہی سے حضرت امام حسینؑ پر مرثیہ شروع ہو گیا تھا۔ علاوہ اُن مرثیوں کے جو خود اہل بیت کی زبان پر آئے جیسے جناب ام کلثوم کا وہ مرثیہ جس کے دو شعر مشہور ہیں اور آپ سنا کرتے ہیں:

مدینۃ جدنا لا تقبلینا — فبالحسرات والاحزان جئنا

خرجنا منک بالاھلین جمعا — رجعنا لا رجال ولا بنینا

"اے ہمارے نانا کے مدینہ اب ہم اس قابل نہیں رہے کہ تجھ میں داخل ہوں کیوں کہ جب ہم گئے تھے تو سروں پر وارثوں کا سایہ تھا، گو دیاں بچوں سے آباد تھیں اب اس حال میں واپس آئے ہیں کہ سروں سے وارثوں کا سایہ اٹھ گیا اور گودیاں بچوں سے خالی ہو گئی ہیں"۔

اس کے بعد کچھ دوسرے شعراء بھی تھے جنھوں نے واقعہ کربلا کے چند ہی روز بعد کہ اپنے تاثرات غم مرثیہ کی صورت میں ظاہر کیے۔ ان میں سے چند شعر دیوان حماسہ ابو تمام میں بھی درج ہیں جو تقریباً سب سے پہلے کے اشعار میں سے ہیں جو امام حسینؑ کے غم میں کہے گئے ہیں۔ اُس نے کہا ہے:۔

مررت علی ابیات آل محمد فلم ارھا امثالھا یوم حلت

(الیٰ اٰخرہ)

اس طرح غم واندوہ اور تاثرات اشعار کے ذریعہ سے ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے مگر اتنی جرأت نہیں تھی کہ مستقل طور پر شاعری کا دور شروع ہو جائے لیکن ابوالعباس سفاح کا زمانہ اور بنی عباس کا ابتدائی دور وہ ہے کہ جس میں ایسے شعراء پیدا ہونے لگے جنھوں نے زندگی کا نصب العین ہی یہی قرار دے لیا کہ وہ اہل بیت کرام پر اپنے تاثرات کا اظہار کریں چنانچہ اسی سفاح کے زمانہ میں ایک شاعر تھا سدیف جو خادموں میں سے خاندان بنی ہاشم کے تھا، اُس نے علانیہ چوراہوں پر کھڑے ہو کر مرثیہ حسین پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جس چوراہے پر کھڑا ہو جاتا تھا کثیر مجمع اُس کے گرد اکٹھا

ہو جاتا تھا اور اُس کے اشعار ایسے دلدوز ہوتے تھے کہ مجمع پر ایک خاص انزطاری ہو جاتا تھا۔

سدیف کی وہ مشہور حکایت جو ذاکرین کی زبان سے کبھی اکثر سنائی دیتی ہے، جس میں سفاح کے دربار میں سدیف کا بنی ہاشم میں سے ایک ایک کا نام لے کر پکارنا اور اُن کے انتقام پر سفاح کو آمادہ کرنا مذکور ہے اگرچہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتی مگر سدیف کی شخصیت اور اُس کا شاعر اہل بیت ہونا کتابوں کے اندر ضرور درج ہے۔

کمیت بن زید اسدی جو ائمۂ لغت میں شمار کیے گئے ہیں اور ان کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے ان کے قصائد "ہاشمیات" ایک مستقل شہرت رکھتے ہیں اور اُن کو یہ افتخار حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار امام کی خدمت میں پڑھے اور امام نے شوق سے سنا اور دعائیں دیں۔ یہ تقریباً سب سے پہلے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے کھلم کھلا مدح اہل بیت کی۔

اگرچہ فرزدق ان کے پہلے ہیں مگر اُن کو پورے طور پر موقع نہیں ملا۔ ہوائے زمانہ اُس وقت بہت مخالف تھی۔ فرزدق وہ ہیں جن کی امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی تھی اُس وقت کہ جب حضرت مکۂ معظمہ سے باہر نکلے تھے اور فرزدق اپنی ماں کو ساتھ لیے ہوئے حج کو جا رہے تھے۔ فرزدق نے پوچھا کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ کوفہ جا رہا ہوں۔ فرزدق نے کہا۔ وہاں نہ جایئے قلوبھم معک و سیوفھم علیٰ مع بنی امیۃ ۔ بڑا ادیب تھا۔ اُس نے بہت بلیغ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ "دل اُن

کے آپ کے ساتھ میں مگر تلواریں اُن کی کل کے دن بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی"

بہر حال فرزدق کی ہمدردی اہلِ بیت کے ساتھ تھی مگر وہ زمانہ ایسا نہ تھا کہ فرزدق کا کوئی کلام اس سلسلہ میں ہم تک پہنچے۔ بے شک ایک ایسا موقع آیا کہ جب وقتی طور سے معرفتِ حق کا جذبہ موجزن ہوگیا اور فرزدق نے ایک ابلتے ہوئے سیلاب کے مانند جناب امام زین العابدینؑ کی مدح میں وہ قصیدہ پڑھ دیا جس کا مطلع ہے:۔

هذا الذی تعرف البطحآء وطأته
والبیت یعرفه والحل والحرام

یہ پورا قصیدہ ایسا ہے کہ دنیائے عربیت میں زورِ کلام کے اعتبار سے اُس کی نظیر نہیں ہے۔ یہ اُس موقع پر کہا گیا تھا کہ جب ہشام بن عبد الملک حج کو گیا ہے۔ حاجیوں کی اتنی کثرت تھی کہ وہ حجرِ اسود تک بوسہ دینے کے لیے نہ پہنچ سکا۔ مجبوراً دور ایک بلند مقام پر بیٹھ گیا اس انتظار میں کہ ذرا ہجوم حاجیوں کا کم ہو تو وہ حجر اسود تک پہنچنے کی پھر کوشش کرے۔ اتنی دیر میں امام زین العابدینؑ جو حج کو آئے ہوئے تھے استلام حجرِ اسود کے لیے آ گئے۔ اور حجرِ اسود تک پہنچنا چاہا۔ جلالِ امامت وہ تھا کہ مجمع ہٹتا گیا اور حضرت آسانی کے ساتھ حجرِ اسود تک پہنچ گئے اور واپس بھی چلے گئے۔ حیرت ہوگئی ہشام کو۔ جب گرد و پیش کے مجمع سے پوچھا یہ کون ہیں؟ تو سب نے کہا ہم نہیں پہچانتے ہیں اب فرزدق کو تاب نہ رہا کہنے لگے:۔

"یہ وہ ہے کہ (جیسے تم سارے ساتھ والے نہ پہچانتے ہوں نہ پہچانیں) سرزمین مکہ

اُن کے قدم کی چاپ پہچانتی ہے اور خانہ کعبہ انھیں پہچانتا ہے اور اُس کے حلّ و حرم اُن سے واقف ہیں۔"

پورا قصیدہ اسی زورِ کلام کا حامل ہے۔

فرزدق کا ہر ہر شعر ہشام کے دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا۔ اُس وقت تو وہ کچھ نہ بولا مگر جب اُسے موقع ملا تو فرزدق کی گرفتاری کا فرمان صادر ہو گیا۔ قید کر دیئے گئے۔

وہ تعریفیں جو بادشاہوں کے دربار میں اُن کے منہ پر کی جاتی ہیں سیم و زر کی لالچ میں ہوا کرتی ہیں۔ مگر یہ تعریف وہ تھی کہ بظاہر امام کو خبر بھی نہیں۔ دشمن کی محفل ہے اور امام کی تعریف ہو رہی ہے۔

بعد میں امام کو خبر پہنچی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فرزدق اس کی وجہ سے قید ہو گئے۔ شاید یہ خیال گزرا کہ فرزدق تو قید ہو گئے۔ اُن کے اہل و عیال بسر کیسے کرتے ہوں گے۔ آپ نے کچھ مال مخفی طریقہ پر اُن کے پاس بھجوا دیا۔ فرزدق نے اسے واپس کیا کہ دوسروں کی تعریفیں جو ہوتی ہیں مال دنیا کی غرض سے کی جاتی ہیں۔ آپ حضرات کی مدح مال دنیا کے لیے تھوڑی کی جاتی ہے۔ میں اس میں سے ایک حبہ نہیں لوں گا۔

پھر جب یہ دور ایسا تھا کہ ایک تعریفی قصیدہ پر قید کی سزا ملتی تھی تو بھلا کہاں ممکن تھا کہ شعراء مظالمِ بنی امیہ اور مصیبتِ امام حسینؑ پر اپنے تاثرات کا اظہار کر سکیں۔

مگر امام محمد باقرؑ کا زمانہ بڑی آزادی کا زمانہ تھا۔ اُس سیاسی ماحول سے جو اس وقت پیدا ہوا تھا۔ فائدہ اٹھا کر کمیت بن زید وغیرہ نے اپنے دل کے حوصلے نکالنا شروع

کر دیے اور فضائل و مناقب اہل بیت اور خصوصاً امام حسینؑ کے مرثیہ میں بڑے بڑے طولانی قصائد نظم کرنے لگے اور بعض اُن میں سے امام کی خدمت میں پیش بھی ہونے لگے۔ امام جانتے تھے کہ یہ لوگ دنیا کے طلبگار نہیں ہیں۔ اس لیے انھیں آخرت کی بشارتیں دی جانے لگیں۔ خدا تمھیں جزائے خیر دے گا۔ تمھارا جگہ جنت عدن میں ہے۔ ہر بیت (شعر) کے عوض میں ایک بیت (قصر) جنت میں ملے گا۔ مداحوں کی بلندی نظر کے مطابق صلوں اور جائزوں کا اعلان ہوتا تھا اور اب اصحاب کو بھی ترغیب و تحریص ہونے لگی کہ مجلس کرو، مجالس میں بیٹھو۔ ہمارے مصائب پر اظہارِ رنج و غم کرو۔

بالکل تاریخی رفتار کے مطابق احادیث کی رفتار بھی ہے۔ امام زین العابدینؑ کی زبانی حدیثیں اس بارے میں نہیں ملتیں کیوں کہ آپ کو اس کا موقع نہیں تھا۔ آپ سے احکام شرعی کے دریافت کرنے کے لیے تقریباً کوئی نہ آتا تھا۔ مسائلِ احکام ہی کے متعلق آپ کی حدیثیں کم ہیں۔ چہ جائیکہ ان چیزوں کے متعلق جو براہِ راست سیاست بنی امیہ پر ضرب لگانے والی تھیں۔ مگر امام محمد باقرؑ کے زمانہ میں جہاں نشر علوم و احکام شریعت زیادہ ہوا، اسی کے ساتھ تذکرۂ اہل بیت اور مراثی امام حسینؑ کے لیے بھی حدیثیں وارد ہونے لگیں۔ اور امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں یہ سلسلہ ترقی پر پہنچ گیا کیوں کہ اب انقلاب سلطنت ہو چکا تھا۔ پرانی سلطنت ختم ہوئی اور نئی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ وہ فضا جو امام محمد باقرؑ کے دور میں شروع ہوئی تھی۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانہ تک زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اسی لیے جس طرح حقائق مذہب اور مسائل شرعیہ زیادہ ہم تک امام

جعفر صادقؑ سے پہنچے اور اس لیے مذہب شیعہ کو "مذہب جعفری" کہا جانے لگا، کیا کہنا اس دور کا۔ چار ہزار شاگرد امام جعفر صادقؑ کے جو آپ سے نقل احادیث کرتے تھے اور جنھوں نے آپ سے استفادۂ علوم کیا تھا۔ ان میں متکلمین بھی تھے۔ ان میں فقہار بھی تھے۔ ان میں مفسرین بھی تھے۔ یہاں تک کہ اصحاب کلام کی ایک جماعت تھی جو ہر وقت دروازہ پر حاضر رہتی تھی۔ اس زمانہ میں مناظرے بھی ہونے لگے۔ لوگ آ آ کر اعتراضات پیش کرنے لگے۔ اور اُن کے جوابات بھی دیے جانے لگے۔

اسی سبب کے ساتھ امام حسینؑ کی یاد قائم رکھنے کی ترغیب و تحریص میں احادیث بھی حضرت کی زبان سے زیادہ وارد ہوئے۔

اس وقت یہ چیز مسلمات بدیہ سے ہو گئی تھی کہ حضرت امام حسینؑ کی مصیبت کو جو عظمت حاصل ہے۔ وہ دنیا کی کسی مصیبت کو حاصل نہیں ہے، اسی لیے امام کی خدمت میں اعتراض پیش کیا گیا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز مسلمات میں سے ہو اُسی پر اس طرح اعتراض کیا جاتا ہے ورنہ یوں پوچھا جا سکتا تھا کہ کیا حضرت امام حسینؑ کی مصیبت تمام مصائب میں سب سے زیادہ عظیم ہے؟ مگر ایسا نہیں ہوا۔ عبداللہ بن فضل نے خدمت امام میں عرض کیا کہ کیف صار یوم عاشوراء یوم مصیبۃ وغمّ و جزع و بکاء دون الیوم الذی قبض فیہ رسول اللہؐ والیوم الذی ماتت فیہ فاطمۃ والیوم الذی قتل فیہ امیرالمومنین والیوم الذی قتل فیہ الحسن بالسم "کیوں عاشور کا دن مصیبت وغم اور گریہ و بکا سے مخصوص

ہو گیا۔ نہ وہ دن کہ جس میں رسالت مآبؐ کی وفات ہوئی اور نہ وہ کہ جس میں جناب فاطمہ زہراؑ کی وفات ہوئی۔ اور نہ وہ کہ جس میں امیر المومنینؑ شہید ہوئے اور نہ وہ کہ جس میں امام حسنؑ کی زہر سے وفات ہوئی۔

حضرت نے فرمایا۔ "امام حسینؑ کی شہادت کا دن تمام دنوں سے مصیبت کی حیثیت سے اس وجہ سے بڑھ گیا کہ وہ اصحاب کسا جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز اور ممتاز تھے پانچ تھے۔ سب سے پہلے جب رسول اللہؐ کی وفات ہوئی تو امیر المومنینؑ زندہ تھے، فاطمہ زہراؑ موجود تھیں، حسنؑ اور حسینؑ برقرار تھے۔ لوگوں کو ڈھارس ان سب سے تھی۔ پھر جب جناب فاطمہ زہراؑ دنیا سے اٹھیں تو امیر المومنینؑ، حسنؑ اور حسینؑ تینوں بزرگوار موجود تھے۔ لوگوں کی تسلی ان سے تھی۔ جب امیر المومنینؑ کی شہادت ہوئی تو حسنؑ و حسینؑ سے دل کا آسرا قائم تھا اور جب حسنؑ دنیا سے رخصت ہو گئے تو پوری مرکز امید حسینؑ کی ذات بن گئی۔ گویا جتنی ہستیاں تھیں وہ سب ایک حسینؑ کو دیکھ کر یاد آجاتی تھیں۔ لیکن جس وقت حسینؑ کی شہادت ہوئی تو اب کون رہ گیا تھا۔ اب اصحاب کساء رحمۃ کے مجبار میں سے کوئی ایسا نہیں تھا کہ جو تسلی خلق کا ذریعہ بن سکے اس لیے امام حسینؑ کا دنیا سے جانا ایسا تھا کہ جیسے وہ سب رخصت ہوئے، جس طرح آپ کی موجودگی ایسی تھی کہ جیسے وہ سب موجود تھے۔

یہ وہی بات ہے جسے ایک خاص انداز میں تھائی دلموزی الفاظ میں جناب زینب کبریٰؑ نے امام حسینؑ کی خبر شہادت کو سن کر بین کرتے ہوئے فرمایا تھا: الیوم مات

جدی محمدؐ المصطفیٰ الیوم مات امی فاطمۃ الزھراؑ الیوم مات ابی علیؑ المرتضیٰ الیوم مات اخی الحسن مجتبیٰ (یعنی، آج میرے نانا رسول اللہ کی وفات ہو رہی ہے، آج میری ماں فاطمہ زہراؑ دنیا سے اٹھ رہی ہیں، آج میرے بابا علی مرتضیٰؑ رخصت ہو رہے ہیں اور آج میرے بھائی حسن مجتبیٰؑ کی شہادت ہو رہی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ حسینؑ زندہ تھے تو یہ سب زندہ تھے اور حسینؑ دنیا سے چلے گئے تو یہ سب چلے گئے۔ یہاں وہ چیز رہ جاتی ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے مصیبت امام حسینؑ کی عظمت کے ثبوت میں پیش فرمایا۔

سننے والا مطمئن ہو گیا ہو تو یہ چاہا کہ امام سے کچھ اور استفادہ کر لوں۔ اس نے پھر اعتراض کیا کہ آخر حضرت امام حسینؑ کے بعد بھی تو امام زین العابدینؑ موجود تھے۔ آپ سے کیوں لوگوں کو اتنی ڈھارس نہ ہوئی جتنی کہ آپ کے آبائے کرام سے ہوئی تھی۔

حضرت نے فرمایا: "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ امام زین العابدینؑ موجود تھے مگر وہ بات اُن میں تھوڑی ہی تھی جو رسول اللہؐ کے سامنے موجود ہونے کی وجہ سے اُن کے بزرگوں کو حاصل تھی۔ وہ حضرات وہ تھے جو رسالت مآبؐ سے براہ راست کسب فیوض کر چکے تھے۔ رسولؐ کے اقوال اُن کے بارے میں سنے جا چکے تھے۔ رسولؐ کی محبت کے مناظر اُن کے ساتھ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ تو جو اُن میں سے نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ پیغمبرؐ کے اقوال اور احادیث اُس کے بارے میں لوگوں کو یاد آجاتے تھے۔ یہ بات سب سے آخر میں امام حسینؑ کو حاصل تھی اور آپ نے چونکہ سب کے آخر میں شہادت پائی اس لیے

آپ کی شہادت سے وہ تمام غم والم تازہ ہو گئے جو ان کے پہلے دوسرے معصوموں کے اٹھنے سے طاری ہوئے تھے اور امام زین العابدینؑ چونکہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں نہ تھے اس لیے آپ کی ذات میں وہ خصوصیت نہ تھی "۔

اس حدیث کو میں نے اس لیے پیش کیا کہ اس سے دو چیزیں ثابت ہوتی ہیں! ایک تو یہ کہ اس زمانہ تک عام طور سے روزِ عاشور روزِ غم و حزن و مصیبت بن گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ سال کے کسی دن کو وہ خصوصیت حاصل نہ تھی جو روزِ عاشور کو حاصل تھی۔

اب ذرا اس کی متضاد تصویر بھی دیکھ لیجیے جس سے ثابت ہو گا کہ عزاداری کے بارے میں جو مخالفت اور متصادم کی صورت بعض حلقوں کی طرف سے' اس وقت نظر آجاتی ہے۔ اس کی ابتدا بھی اس وقت ہو چکی تھی۔ پوچھنے والا عرض کرتا ہے:۔ کیف سمّت العامّة یوم عاشوراء یوم برکة۔ " یہ عام لوگوں نے عاشور کو مبارک دن کیسے قرار دے لیا ہے؟ "

بس یہ پوچھنا تھا کہ جیسے امام کے دل پر ایک نشتر لگا فرمایا:۔ لما قتل الحسینؑ تقرّب الناس بالشام الی یزید فوضعوا له الاخبار واخذوا علیها الجوائز من الاموال فکان مما وضعوا له امر هذا الیوم وانه یوم برکة لیعدل الناس فیه من الجزع والبکاء والمصیبة والحزن الی الفرح والسرور والتبرک والاستعداد فیه حکم الله بیننا وبینهم

" جب امام حسینؑ شہید ہوے تو راویانِ احادیث نے یزید کی بارگاہ میں رسوخ

حاصل کرنے کے لیے ایسی حدیثیں ایجاد کیں کہ عاشور کا دن ایسا برکت کا ہے اور ایسا مبارک ہے۔ اس پر اُنھوں نے انعامات حاصل کیے۔ اور وہ لوگ اس دن خوشی اور جشن مسرت میں مصروف ہو گئے اور روزے رکھنے لگے تاکہ امام حسینؑ کی مصیبت پر اظہار رنج وملال کرنے کی طرف عام لوگوں کو توجہ نہ ہو۔ بس اللہ ہی ہمارے اور اس دنیا کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے۔"

معلوم ہوا کہ بنی امیہ کے تابعین اور کچھ سادہ لوح مسلمان دھوکا کھا کر اُس وقت بھی ایسے ہو گئے تھے جو روز عاشور کو خوشی مناتے تھے اور مبارک خیال کرتے تھے۔ ائمہ معصومین نے اسی گروہ کے مقابلہ میں روز عاشور کو روزِ غم بلکہ تمام ایام غم سے زیادہ محل اندوہ وملال ثابت کرنے میں اہتمام فرمایا اور جس طرح امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ خود شریک مصیبت رہ چکنے کے ساتھ مصیبت حسینؑ میں گریاں اور اندوہناک رہتے تھے، اُسی طرح بعد کے ائمہ میں سے ہر ایک امام اپنے وقت میں مجسمۂ غم حسینؑ بنا رہا۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ بھی مصیبت حسینؑ سے ہر زمانہ میں اور بالخصوص ایام محرم میں انتہائی متاثر نظر آتے تھے۔ چنانچہ ابو عمارہ منشد کی روایت ہے :۔

۱ ماذکر الحسین بن علیؑ عند ابی عبد اللہؑ فی یوم قط فرأی ابو عبد اللہ متبسما فی ذلک الیوم الی اللیل " کبھی ایسا نہیں ہوا کہ امام جعفر صادقؑ کے سامنے امام حسینؑ کا ذکر آگیا ہو اور پھر رات تک کسی نے آپ کو متبسم ہوتے دیکھا ہو۔"

اب یہ بھی ہونے لگا کہ تفصیل آتے ہیں اور حضرت دریافت فرماتے ہیں :۔

تجلسون وتتحدثون؟
"کیوں تم لوگ آپس میں بیٹھ کر کچھ واقعات شہادت امام حسینؑ کا تذکرہ بھی کرتے ہو؟"

فضیلؔ نے کہا جی ہاں ہماری جانیں آپ پر نثار۔ ایسا ہوتا ہے۔ حضرت نے فرمایا۔

"ان تلک المجالس احبھا فاحیوا امرنا یا فضیل فرحم اللہ من احییٰ امرنا"۔

"اس طرح کے اجتماعات کو میں محبوب رکھتا ہوں"۔ مصائب حضرت امام حسینؑ کا تذکرہ جس اجتماع میں ہو اُس کے لیے "مجلس" کی لفظ غالباً اسی حدیث سے ماخوذ ہے یعنی لغوی حیثیت سے ہر نشست خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی اور جس مقصد سے بھی ہو مجلس ہے مگر چونکہ امامؑ نے یہ لفظ اس محل پر صرف فرمادی تھی۔ تو اب یہ اسم خاص بن گئی ایسے ہی اجتماع کے لیے جو مخصوص اس مقصد سے ہو۔ حالانکہ امام کا استعمال کرنا بلحاظ خصوصیت نہ تھا بلکہ معنی لغوی کے مصداق کی حیثیت سے تھا۔ فرماتے ہیں۔

ہماری یاد کو زندہ رکھو۔ اللہ اپنی رحمت سے مالا مال کرے اس کو جو ہمارے امر کو زندہ رکھے۔

یہ کہا حضرت نے ایک شخص سے مگر جیسے نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا۔ ایسے ہی اُس زمانہ والوں میں اکثر اُن لوگوں تک پہنچا جو اہل بیت کرام سے کچھ بھی تعلق رکھتے تھے اور اس طرح مجالس عزا کے انعقاد کی طرف توجہ وانہماک پیدا ہو گیا۔

اب یہ بھی شروع ہو گیا کہ ابو عمارہ خدمت امام جعفر صادقؑ میں حاضر ہوے

یہ "منشد" تھے یعنی مختلف شعراء کا کلام حفظ کر کے سنانا اُن کا پیشہ تھا۔ اُن سے حضرت نے فرمایا انشدنی فی الحسین بن علیؑ "کچھ اشعار سناؤ جو امام حسینؑ کے بارے میں ہوں"۔ ابو عمارہ نے اشعار سنائے۔ حضرت نے گریہ فرمایا۔ ایک شاعر کا قصیدہ ختم ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا اور پڑھو۔ اُنھوں نے دوسرا مرثیہ سنایا۔ حضرت اور روئے۔ ابو عمارہ کہتے ہیں کہ میں پڑھتا رہا اور حضرت گریہ فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ گھر کے اندر سے بھی رونے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ شعرائے اہلبیت کتنے کثرت سے ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ راویان اشعار جو خود شاعر نہیں تھے اور دوسروں کا کلام حفظ کیا کرتے تھے اُن کے محفوظات میں ایک کافی ذخیرہ مراثی امام حسینؑ کا ہو گیا تھا اور متعدد شعراء کا کلام یاد تھا کہ جب ایک ختم ہوا تو دوسرا شروع کر دیا اور پھر فرمائش ہوئی تو تیسرا شروع کر دیا۔ جب اُس کلام میں کہ جو صرف ایک شخص کو حفظ تھا اتنے مراثی موجود تھے تو اس سے اندازہ کیجیے کہ بجائے خود کس قدر کلام کا ذخیرہ ہو گیا تھا کہ جو مخصوص امام حسینؑ کے بارے میں تھا۔

یہ صرف ناواقفیت ہے کہ مولانا شبلی نے جو ایک طبقہ میں ہمارے ہندوستان کے اسلامی مورخ مانے جاتے ہیں، یہ لکھ دیا ہے کہ امام حسینؑ کی شان میں خود عرب جہاں یہ حادثہ ہوا تھا وہاں کچھ زیادہ مرثیے نہیں کہے گئے۔

اس پر اگر مخصوص طور پر بحث کی جائے تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تو ضمنی طور پر ایک اشارہ کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو گیا کہ دوسری صدی ہجری کے وسط تک کافی

خیرہ مراثی امام حسینؑ کا فراہم ہو چکا تھا۔

زید شحام راوی ہیں کہ ہم اور کچھ لوگ باشندگانِ کوفہ میں سے بیٹھے ہوئے تھے کہ اس اثناء میں جعفر بن عفان امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ محفل بھری ہوئی تھی مگر حضرت نے جعفر بن عفان کو اپنے قریب بلایا اور اپنے پاس اُن کو جگہ دی فرمایا اے جعفر۔ اُنھوں نے کہا کیا ارشاد ہوتا ہے ہماری جانیں آپ پر نثار۔ یہ ایک مخصوص امتیاز تھا ائمہ معصومین علیہم السلام سے گفتگو میں جسے اصحابِ ائمہ نے پابندی کے ساتھ اختیار کر لیا تھا کسی اور سے گفتگو میں ہم کو اتنی پابندی کے ساتھ یہ نظر نہیں آتا کہ ہر بات میں کہنے والا کہے کہ میری جان آپ پر نثار ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بھی روزِ عاشور نصرت کی تمنا کا ایک نتیجہ تھا۔ ہمیشہ کے لیے دل میں حسرت رہ گئی کہ ہم فدا کیوں نہ ہوئے۔ اس لیے ہر امام سے گفتگو کا ایک جزو بنا لیا گیا کہ اللہ ہم کو موقع دے کہ ہم آپ پر اپنی جان نثار کریں۔ بہرحال امام نے ارشاد فرمایا مجھے خبر معلوم ہوئی ہے کہ تم امام حسینؑ کے بارے میں شعر بہت اچھے کہتے ہو۔ عرض کیا۔ جی ہاں میں شعر نظم کیا کرتا ہوں۔ اللہ مجھے آپ پر نثار کرے۔ فرمایا پھر پڑھو۔ میں نے اشعار پڑھنا شروع کیے۔ حضرت نے گریہ فرمایا اور تمام لوگوں نے جو آپ کے پاس تھے گریہ کیا۔ یہاں تک کہ آنسو بہہ کر چہرہ اور ریشِ مبارک پر آئے۔ امام نے فرمایا کہ اے جعفر اتنا ہی مجمع نہ سمجھنا۔ بلکہ اللہ کے مقرب ملائک اس وقت موجود ہیں جو تمھارا کلام سُن رہے ہیں اور اے جعفر جیسے ہم لوگ رو رہے ہیں" یہ فرشتے بھی بکا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ جعفر خداوند عالم تم کو

اس کا صلہ دے گا۔ جو شعر تم نے کہے ہیں خداوند عالم اپنی رحمت اور اپنی جنت تم کو عطا فرمائے گا۔

ایک مشہور شاعر اس دور کے سید اسمٰعیل بن محمد حمیری بڑے جلیل القدر محب اہلِ بیت تھے۔ شروع میں امام جعفر صادق کے ساتھ عقیدت نہیں رکھتے تھے مگر آخر عمر میں توبہ کرلی۔ امام جعفر صادق کے مخلصین میں داخل ہو گئے اور شاعرِ اہل بیت بن گئے۔

کمیت ان سے سابق ہیں مگر انھوں نے اتنا کثیر ذخیرہ نہیں چھوڑا جتنا بڑا ذخیرہ سید اسمٰعیل حمیری نے چھوڑا۔ سید ان کے نام کے ساتھ نسبی نہیں بلکہ صرف ایک ذاتی لقب کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی عمر وقف کر دی تھی اہل بیت کرام کی مدح میں اور امام حسین کے مراثی بھی نظم کیے۔

امام جعفر صادق کے زمانہ میں امام حسین پر تاثرات غم اصحاب ائمہ اور شیعیانِ اہل بیت میں اتنے نمایاں ہو گئے کہ غیر مذہب کے افراد تک کو اس کا احساس ہوتا تھا چنانچہ حضرت کے اصحاب میں سے ایک بزرگ حضرت کے پاس حاضر ہوے اور انھوں نے بیان کیا کہ ہمارا ایک غلام ہے جو ترکستان کا رہنے والا ہے اور اس مذہب کے متعلق کچھ معلومات نہیں رکھتا مگر جب ہم میں سے کسی کو غصہ آتا ہے اور اس پر خفا ہونا چاہتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے تم کو قسم اسی کی جسے جب تم یاد کر لیتے ہو تو رونے لگتے ہو۔

معلوم ہوا کہ یہ ایک نمایاں اثر ہر فرد میں پیدا ہو گیا تھا جس کا غیروں کو بھی اندازہ ہونے لگا تھا، اور جو واقف نہ تھے اُن کو غم امام حسین متوجہ کر رہا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ قسم اُسی

کی دی جاتی ہے جو ایک خاص عظمت کا مالک ہو۔ غمِ حسینؑ کی اس پائدار تاثیر ہی سے اُس نے یہ اندازہ کر لیا کہ یہ ایک بڑی عظیم شخصیت ہے جس کی مصیبت آج تک رلا رہی ہے

اسی امام جعفر صادقؑ کے دور میں بعض افراد بنی ہاشم نے حکومت وقت کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ ابتدا اس کی آخر عہد بنی امیہ سے ہو گئی تھی۔ جب امام زین العابدینؑ کے فرزند زیدؔ نے صف آرائی کی اور کثیر تعداد میں ایسے لوگ تھے۔ جنھوں نے جناب زید کا ساتھ دیا۔ یقیناً امام جعفر صادقؑ کو زیدؔ سے ہمدردی تھی مگر آپ اپنی بصیرت کی نگاہ سے انجام کو دیکھ رہے تھے۔ آپ نے اُن کے ساتھ اتحاد عمل نہیں فرمایا بلکہ اُن کو مشورہ دیا کہ وہ ایسا نہ کریں۔ مگر انھوں نے انصار کے جوش و خروش کو دیکھ کر اور سلطنت کی طاقت کا اندازہ نہ کر کے مقابلہ پر کمر ہمت باندھ لی اور جنگ کر کے شہید ہوئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کی لاش کو سولی پر چڑھایا گیا۔ ایک مدت تک لاش محلہ کناسہ میں سولی پر چڑھی رہی۔

قاعدہ ہے کہ جب کسی دل پر کوئی داغِ غم پرانا ہو اور بعد میں کوئی نیا غم پیدا ہو جائے تو پرانا بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ زید پر ختم نہیں ہوا بلکہ ان کے فرزند حسین ذوالدمعہ بھی شہید ہوئے۔ اُن کے بیٹے یحییٰ بھی قتل ہوئے۔

یہ تو ایک احساس فرض اور مصلحت اندیشی کی مجبوری تھی کہ امام جعفر صادقؑ نے ان لوگوں کا ساتھ نہیں دیا مگر کیا آپ کے دل پر اُن کی شہادت کا اثر نہیں ہوا؟ زید

کی شہادت کی اطلاع جب پہنچی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو کر ریشِ مبارک تک آگئے اور زید کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔

یہ حوادث و مصائب کتنے تھے جن میں امام حسینؑ کی یاد تازہ ہوتی رہی۔

خود زید نے میدانِ جنگ میں یاد کیا اور ان لفظوں کے نعرہ جنگ اپنا یہی قرار دیا کہ یاآل ثارات الحسین یعنی "کہاں ہیں حسینؑ کے خون کا بدلا لینے والے۔ گویا ان کے نزدیک یزید ہر سلطان باطل تھا جو تختِ سلطنت پر غلط طور پر متمکن ہو اور صاحبانِ حق کے حقوق کو غصب کرے۔

بنی ہاشم اور اولادِ فاطمہ میں سے ایسے خروج کرنے والوں کا سلسلہ زمانہ بنی عباس میں بھی رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو چیز ہم آج زبانوں پر لا رہے ہیں اور تاریخی حیثیت سے ہر مؤرخ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہے کہ بنی عباس نے اقتدار حاصل کیا آلِ محمد کی طرف عوام کے میلانِ قلب سے فائدہ اٹھا کر۔ یہ جب ہم آج محسوس کرتے ہیں تو خود افرادِ بنی ہاشم اور اولادِ رسول یعنی سادات بنی فاطمہ کو جو اس وقت موجود تھے کیا یہ امر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے جو جذبات سے بلند سطح پر تھے یعنی معصومین انھوں نے بس احساس کیا اور شاید کبھی زبان سے بطورِ احتجاج اظہار کر دیا ہو مگر اپنے عملی اقدامات کو فرائض کے شکنجہ میں مقید رکھا لیکن ایسے افراد بھی اس خاندان میں تھے کہ جو انسانی فرض شناسی یا اخلاق یا عملی ذمہ داری کی بلندی پر اس درجہ تک نہیں تھے جس کو عصمت کہا

جاتا ہے۔ انھوں نے اس کو محسوس کیا اور احساس کے ساتھ کبھی شدت کے ساتھ چیخ اُٹھے اور کبھی بے تاب ہو کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔

سبب یہ تھا کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد آلِ رسول سے بالکل بے اعتنائی اور سرد مہری کی جانے لگی۔ بلکہ اُن پر مظالم کیے جانے لگے۔

عام انسانی فطرت کے لحاظ سے یہ بات نہایت غصہ کی ہے اور تکلیف دہ ہے اور بسا اوقات جوش سے بے قابو بنا دینے والی ہے کہ ہمارے ہی نام سے کوئی اقتدار حاصل کیا جائے اور پھر ہمیں کو اُس اقتدار کی چکی میں سب سے پہلے پیسا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ متعدد افراد جو ہمت ولولہ اور عزم والے تھے وہ مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نتیجہ میں یہ لوگ دردناک طریقہ پر شہید کیے گئے اور ہر ایک حادثہ نے غمِ امام حسینؑ کی یاد تازہ کی۔ بے شک اس طرح کی کوششوں کا ایک بڑا ناخوش گوار نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ بنی عباس کو ساداتِ بنی فاطمہ پر مظالم ڈھانے کا بڑا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

چنانچہ امام جعفر صادقؑ کے بعد کا زمانہ نہایت تاریک ہے اور ایک دور انتہائی مصیبت ناک ہے۔ یہ امام موسیٰ کاظمؑ کا دورِ امامت ہے۔ تلاش کے بعد بھی امام موسیٰ بن جعفرؑ سے کوئی حدیث غم و ماتمِ امام حسینؑ کے متعلق نہیں ملتی۔ ملتی کیسے! زمانہ وہ تھا کہ امام سے لوگ کھل کر روایتِ حدیث تک نہیں کر سکتے تھے بلکہ اصحاب نے اصطلاح مقرر کر لی تھی۔ جب یہ کہنا ہوتا تھا کہ امام موسیٰ بن جعفرؑ نے یہ فرمایا تو کہتے تھے قال العالمؑ یعنی "عالم نے کہا" یا عن الرجل الصالح یعنی "نیک مرد سے ایسا منقول

ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ عہد وہ تھا کہ امام کا نام تک راویانِ حدیث کی زبان پر نہیں آسکتا تھا۔ اور ایک مدت تک زندان میں اسیری اور پھر وہ قید تنہائی کہ جس میں تاکید تھی کہ امام تک کوئی پہنچ نہ سکے۔ اس صورت میں کہاں یہ موقع تھا کہ آپ ذکرِ اہلبیت یا ماتم و مجلس امام حسینؑ کے لیے ترغیب و تحریص فرماتے۔

یہ زمانہ ایسا تھا ہی نہیں کہ اس میں کوئی مجلس ہو سکتی یا کوئی ماتم برپا ہو سکتا۔ بلکہ ہارون رشید نے تو امام حسینؑ کی قبرِ مبارک کو صدمہ پہنچانے کی کوشش تک کی۔ اس دور میں اگر لوگ زیارتِ قبرِ حسینؑ کو جاتے تھے تو چھپ کر جاتے تھے۔ اس زمانہ میں تبلیغِ حق کے لیے لوگ دیوانے بنے اور مجنونوں کی صورت اختیار کی۔ وہ بہلول دانا بہلول دیوانہ کہلاتے تھے اور زید مجنون۔ دونوں داعی حق تھے جو مذہب کی خاطر دیوانے بنے تھے۔ ان کے تذکرے اگر دیکھیے اور ان کی گفتگوئیں اگر سنیے تو معلوم ہوگا کہ وہ کتنے علم و معرفت میں بھرے ہوئے ہیں مگر مصلحتِ وقت یہی تھی کہ وہ دیوانہ بن کر صدائے حق کو کبھی گوشش زد کر دیں۔

ہارون الرشید کے بعد مامون کا دورِ سلطنت ہے۔ چونکہ ہارون کی سخت گیریوں سے ملک میں بغاوتیں برپا تھیں اور آلِ محمد کے ساتھ ہمدردی بڑھی ہوئی تھی اس لیے مامون پالیسی بدلنے پر مجبور ہوا اور اُس نے آلِ محمد کے دامن میں پھر پناہ لینے کی ضرورت

محسوس کی اور اسی ذیل میں امام رضاؑ کو ولی عہد بننے پر مجبور کیا۔

آپ بہت انکار فرماتے رہے مگر جس طرح جناب امیرؑ نے بہت انکار کے بعد چوتھے دور میں خلافت ظاہری قبول فرمائی، اسی طرح امام رضاؑ نے بہت انکار کے بعد ولی عہد بننا منظور کر لیا۔ مگر اس صورت سے کہ حمایتِ باطل کی ذمہ داری آپ پر نہ عائد ہو سکے۔ آپ نے شرط کی کہ میں کسی ماتحت حاکم کو معزول نہیں کروں گا، نہ کبھی کسی کو مقرر کروں گا، سلطنت کا کوئی کام میرے ہاتھ سے نہ ہو گا۔ یہ شرائط طے کرنے کے بعد مقرر کیے گئے۔

دنیا مشتاق تھی آلِ محمد کا جلوہ دیکھنے کے لیے۔ اب اس کی آرزو پوری ہوئی۔ سنتے ہوں گے لوگ کہ آلِ رسول میں سے کوئی موسیٰ کاظمؑ ہیں۔ اس زمانہ میں کسی کو موقع زیارت کا حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب جو امام رضاؑ کرسی امامت پر جلوہ افروز ہوئے اور دنیا کو معلوم ہوا کہ یہ ہم کتنی موسیٰ بن جعفر کے فرزند علی بن موسیٰؑ ہیں تو وہ آپ کی سمت امنڈ پڑی۔ اور چونکہ اس کے پہلے جب بنی امیہ کے خلاف بنی عباس کی طرف سے علم بغاوت اٹھایا گیا تو الرضا من آل محمد کو سرنامہ قرار دیا یعنی ہم آلِ رسول کی حکومت کے لیے راضی ہیں۔ اس لیے جب امام رضاؑ ولی عہد قرار دیے گئے تو آپ کی مہر میں الرضا من آل محمد لکھا گیا۔ اس طرح گویا یہ دکھلایا جا رہا تھا کہ ہم نے جس نام پر سلطنت حاصل کی تھی اقتدار بھی اسی کے سپرد کر دیا۔ اگرچہ حکومت کی نیت اس میں بھی بخیر نہ تھی مگر جیسے اس کے پہلے موقع کے سیاسی حالات سے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کو موقع مل گیا۔ فرائض امامت کے انجام دینے کا اسی طرح اس ظاہری ولی عہدی کے پردہ

میں امام رضاؑ کو کچھ موقع مل گیا۔ اپنے آباؤ اجداد کے تعلیمات پھیلانے اور اپنے بزرگوں کی یاد قائم کرنے کا چنانچہ امام رضاؑ سے عزائے حسینؑ کے متعلق حدیثیں پائی ہیں۔ ایسا دائرہ بھی وسیع ہو گیا تھا یعنی اس کے پہلے جو کچھ تھا وہ عرب میں ہوتا تھا، اب ایران کے اندر ہو رہا ہے اور یقین کے ساتھ کہنا چاہیے کہ ایران کے اندر جو اہل بیت کرام کے ساتھ خاص تعلق پایا جاتا ہے اس میں امام رضاؑ کے قیام کا بہت بڑا اثر ہے

امام رضاؑ مرو میں رہتے تھے۔ یہ مرو کا مقام اس موجودہ شہر کے قریب تھا جسے مشہد مقدس کہا جاتا ہے۔ خراسان تو اس پورے صوبہ یا علاقہ کا نام ہے اور اس شہر کا نام طوس تھا۔ مرو کی طرف نسبت اکثر علماء اور رجال حدیث کے نام کے ساتھ مروزی کی لفظ سے پائی جاتی ہے۔ چونکہ مرو کے آخر میں حرف علت یعنی واؤ تھا جس سے بلا فاصلہ دوسرے حرف علت یعنی ی کا متصل ہونا باعث ثقل ہے اس لیے درمیان میں ز کا اضافہ کیا گیا جیسے رے کی طرف نسبت میں رازی کہا جاتا ہے۔

یہ مقام یعنی مرو جہاں امام رضاؑ کا قیام تھا، تقریباً ایران کے وسط میں واقع ہے۔ ہر ایک طرف کے لوگ یہاں آتے تھے اور یہاں آتے تھے اور یہاں امام رضاؑ کی یہ حالت کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور بس حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اب ترغیب و تحریص شروع ہو گئی کہ ہماری یاد کو زندہ کرو۔ ارشاد ہوتا ہے: من تذکر مصابنا و بکی لما ارتکب منا کان معنا فی درجتنا یوم القیامۃ "جو ہماری مصیبت یاد کر کے روئے اُن مظالم کو سن کر جو ہمارے ساتھ ہوئے ہیں وہ روز قیامت

ہمارے درجہ میں ہوگا۔" ومن ذکر بمصابنا فبکی وابکی لم تبک عینہ یوم تبکی العیون "جو ہمارے مصائب کو یاد کر کے خود روئے اور دوسروں کو رلائے تو اُس کی آنکھ اُس دن روتی نہ ہوگی جس دن دوسری آنکھیں روتی ہوں گی۔"

ومن جلس مجلسا یحیی فیہ امرنا لم یمت قلبہ یوم تموت القلوب "جو اُس مجلس میں بیٹھے کہ جہاں ہماری بات زندہ کی جاتی ہے، اُس کا دل اُس دن مردہ نہ ہوگا جس دن تمام دنیا والوں کے دل مردہ ہوں گے۔"

یہ حدیثیں وہ ہیں جو عمومیت کے ساتھ وارد ہوئیں۔ اس کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ کبھی ابن شبیب سے کبھی کسی اور راوی سے تذکرے ہونے لگے۔

محرم کا زمانہ ہے، لوگ حاضر ہیں دوست بھی اور دشمن بھی۔ کیونکہ اس کے پہلے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں جو لوگ کسی حد تک امام کی معرفت یا حضرت کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے وہی حاضر ہوتے تھے لیکن اب امام فقط امام نہیں ہیں۔ اب وہ امام بھی ہیں اور ولی عہدِ سلطنت بھی تو اب دائرۂ تبلیغ وسیع ہوگیا اب امام کے پاس حاضر ہونے والے کچھ وہ ہیں جو آپ کے سامنے امام سمجھ کر حاضر ہیں اور زیادہ وہ ہیں۔ جو ولی عہدِ سلطنت سمجھ کر حاضر ہیں۔ امام محرم کے زمانہ کا تعارف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

ان المحرم شھر کان اھل الجاھلیۃ یحرمون فیہ القتال

"محرّم کا زمانہ وہ تھا کہ جس میں اسلام کے پہلے جاہلیت کے لوگ بھی جدال و قتال

کو حرام سمجھتے تھے۔" انداز بتلاتا ہے کہ اُس مجمع میں یہ بیان ہو رہا ہے کہ جس میں حالات سے واقف لوگ نہیں تھے اور آپ اُن کو حالات سے باخبر بنا رہے تھے۔ فرماتے ہیں :۔

فاستحلت فیہ دماؤنا وھتکت فیہ حرمتنا وسبی فیہ ذرارینا ونساؤنا واضرمت النیران فی مضاربنا وانتھب مافیھا من ثقلنا ولم ترع لرسول اللہؐ حرمۃ فی امرنا۔

(اہل جاہلیت تک تو اتنا اس مہینہ کا احترام کا خیال رکھتے تھے) مگر اس مہینہ میں ہمارے خون کو حلال سمجھ لیا گیا۔ ہماری ہتک حرمت کی گئی ہمارے بچوں اور عورتوں کو قید کیا گیا، ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی، مال واسباب لوٹا گیا اور رسالت مآبؐ کی حرمت کا ہمارے بارے میں لحاظ نہیں کیا گیا۔

ان یوم الحسینؑ اقرح جفوننا واسبل دموعنا واذل عزیزنا بارض کرب وبلا واورثنا الکرب والبلاء الی یوم الانقضاء

"حضرت امام حسینؑ کے روز شہادت نے ہماری آنکھوں کو زخمی کر دیا، ہمارے آنسوؤں کو جاری کیا اور ہمارے بڑے عزت دار کی ذلت کا باعث ہوئے اور روزِ قیامت تک کے لیے رنج و ملال کو ہماری میراث بنا دیا۔"

یہاں تک تو مصیبت کی اہمیت اور آل محمد کے متاثرات کا اظہار تھا۔ اب دوسروں کو بھی متاثر ہونے کی دعوت دیتے ہیں فرماتے ہیں۔

فعلی مثل الحسینؑ فلیبک الباکون

"حسینؑ ایسے انسان پر رونے والوں کو زیبا ہے کہ وہ گریہ کریں۔"

پھر آپ نے اپنے والد بزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ کی سیرت کا تذکرہ فرمایا کہ وہ حضرت جب ماہ محرم آ جاتا تھا تو پھر ہنستے ہوئے کبھی دکھلائی نہ دیتے تھے اور رنج کا غلبہ ہو جاتا تھا یہاں تک کہ اسی سال میں نو دن پورے گزرتے تھے جب دسواں دن ہوتا تھا یعنی روزِ عاشور تو وہ دن آپ کے انتہائی حزن و بکا کا ہوتا تھا اور فرماتے تھے کہ یہ وہ دن ہے جس میں ہمارے حیدرؑ بزرگوار کی شہادت ہوئی۔

اسی طرح ریان ابن شبیب جب حاضر ہوئے۔ محرم کی پہلی تاریخ تھی۔ حضرت نے فرمایا:

یا ابن شبیب ان المحرم ھو الشھر الذی کان اھل الجاھلیۃ فیما مضی یحرمون فیہ الظلم والقتال لحرمتہ فما عرفت ھذہ الامۃ حرمۃ شھرھا ولا حرمۃ نبیھا

"اے ابن شبیب اس مہینہ کو اہل جاہلیت بھی اتنا محترم سمجھتے تھے کہ جدال و قتال نہ کرتے تھے مگر اس امت نے اس مہینہ کی حرمت نہ سمجھی، نہ اپنے نبی کی حرمت سمجھی۔

اس کے بعد آپ نے مصائب کا تذکرہ فرمایا اور گریہ کی دعوت دی۔

اسی طرح مختلف شعرا بھی حاضر خدمت ہونے لگے جیسے عبد اللہ بن ثابت اور دعبل بن علی خزاعی دعبل حضرت کے پاس مرو میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ میں نے ایک قصیدہ فکر کیا ہے اور اپنے دل میں یہ ارادہ کیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی کو نہیں سناؤں گا۔

حضرت نے فرمایا پڑھو۔ دعبل نے پڑھا وہ مشہور مرثیہ

افاطم لو خلت الحسین مجدلا

یہ وہ دردناک مرثیہ ہے جس میں آغاز ہی سے حضرت فاطمہ زہرا کو مخاطب کیا ہے گویا کہا ہے۔ اے دختر پیغمبر۔ اے حضرت فاطمہ زہرا۔ ذرا میدان کربلا میں تشریف لاکر تو دیکھیے۔ آپ کی اولاد پر کیا کیا مظالم گزر رہے ہیں۔"

امام نے صلہ کے طور پر دعبل کو ایک قیمتی حلہ بھی دیا۔ دعبل نے کہا کہ یہ قیمتی حلہ نہیں چاہتا ہوں۔ اپنے جسم کا اترا ہوا لباس مجھ کو مرحمت فرمائیے۔

امام نے اُن کی خوشی پوری کی اور اس حلہ کے ساتھ ساتھ ایک اپنے پہننے کا جبہ بھی مرحمت فرمایا۔ دعبل وہ مقدس لباس لے کر روانہ ہوئے اور قم کی طرف سے گزر ہوا جو مرکز ایمان تھا۔ وہاں کے لوگ اس جبہ کی زیارت کو آئے اور ایک ہزار اشرفی قیمت دینے لگے اور کہا یہ لباس ہم کو دے دو۔ دعبل نے کہا میں اس کا ایک ٹکڑا بھی ایک ہزار اشرفی کو نہیں دے سکتا۔ جب تمام لوگوں نے مجبور کیا تو دعبل نے ایک ہزار دینار لیے اور اُس جبہ کا ایک ٹکڑا بھی اپنے پاس رکھنے کے لیے لے لیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب زمانہ ایسا آ گیا تھا کہ اس حد تک سچے مسلمانوں کو آل محمد کے ساتھ اظہار عقیدت کا موقع مل جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مجالس امام حسینؑ بھی اس دور میں آزادی کے ساتھ کثرت سے منعقد ہونے لگی تھیں۔ مگر یہ زمانہ بھی عارضی تھا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد مامون کو گویا اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے

آلِ محمد کو اقتدار حاصل ہونے کا موقع کیوں دیا۔ اور امام رضاؑ اس جلیل دنیوی منصب پر فائز ہونے کے باوجود سیرت کا وہی نمونہ پیش کر رہے تھے جو اُن کے آباؤ اجداد کا تھا۔ مہمانوں کے لیے اچھے اچھے کھانے مگر امام حضرت نمک کے ساتھ اور پنیر کے ساتھ غذا نوش فرما رہے ہیں۔ دن کو روزے رکھنا اور رات کو اس سے افطار کرنا۔ مامون کو اندازہ ہوا کہ یہ تو اپنے اخلاق سے قلوب کو جذب کر لیں گے اور بنی عباس کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ تھی کہ حضرت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے موقع پر خاموش نہ رہتے تھے۔ مامون کو ذرا ذرا سی بات پر جو خلافِ حکمِ شرع ہو ٹوکتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ملاحظہ فرمایا کہ وضو میں غلام پانی ہاتھ پر ڈال رہا ہے اور بادشاہ چلو میں لے کر وضو کر رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا استعانت بالغیر اس طرح سے وضو میں مکروہ ہے۔ یہ تو ریاست کا نتیجہ ہے کہ انسان راحت طلب ہو جاتا ہے۔ کیا ایک بیس کے ہاتھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ لوٹا اُٹھا سکے۔ انسان کو اتنا آرام طلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فرائضِ ذاتی کو بھی اس وقت تک انجام نہ دے جب تک کہ نوکر اُس کی مدد نہ کریں۔

مزاجِ سلطنت ان باتوں کو کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مامون کو پرخاش پیدا ہو گئی اور آخر کار مامون نے وہ تحفہ پیش کیا (زہر میں بجھے ہوئے انگور) جس کے بعد آپ کو اس عالمِ ظاہر میں رہنا ممکن نہ ہوا۔

مگر آلِ محمدؐ کا اثر اتنا ہو چکا تھا کہ مامون کھل کر اپنے کو قاتل امام رضاؑ نہیں ظاہر کر سکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹروں کو رشوتیں دیں اور اہتمام کیا اس میں کہ کسی طرح لوگ اس کو قاتل امام نہ سمجھیں۔ لوگوں کو چہرۂ امام دکھلا دکھلا کر گواہیاں لی گئیں کہ ان کو زہر نہیں دیا گیا ہے۔

ایک صاحب فہم اسی اہتمام ہی سے یہ نتیجہ نکال سکتا تھا کہ زہر ضرور دیا گیا ہے۔ ورنہ عالم حالات میں یہ ضروری نہیں ہوا کرتا کہ کسی کی موت کی نوعیت کے متعلق گواہیاں حاصل کی جائیں اور ڈاکٹروں سے سندلی جائے۔ حکومت کے دباؤ سے یہ سب گواہیاں اور سندیں حاصل ہو جائیں مگر حقیقت شناس افراد جانتے تھے کہ اس کے کیا معنی ہیں؟

امام رضاؑ کی وفات ہو گئی۔ امام محمد تقیؑ اپنے والد بزرگوار کی رحلت کے وقت نہایت کم سن تھے۔ تاجدار حکومت نے شروع میں آپ کو اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کی اور خیال کیا کہ ان کی کم سنی سے ممکن ہے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اسی لیے اپنی لڑکی کے ساتھ عقد کرنا تجویز کیا۔ اگرچہ بنی عباس نے بڑی مخالفت کی کہ اولادِ فاطمہ سے ایک چھوٹا سا بچہ جس کی کوئی علمی قابلیت بھی ابھی نہیں ہے، اس کے ساتھ شاہزادی کا عقد کیوں کیا جاتا ہے۔ مگر مامون نے جواب دیا کہ تمہیں ان کی قابلیت علمی کا اندازہ نہیں ہے مجھے تو ہے۔ آج جتنے عالم و فاضل موجود ہیں وہ سب جمع کر لیے جائیں اور یہ دیکھ لیا جائے کہ فرزندِ رضاؑ کی قابلیت کیا ہے۔ چنانچہ تمام علمائے مذاہب جمع ہوئے اور امام محمد تقیؑ نے اسی کم سنی کے عالم میں سب سے مناظرہ کیا اور سب خاموش ہو گئے

جمع متفق ہو گیا کہ علم و کمال میں اس وقت دارالسلطنت بھر میں کوئی ان کے مثل نہیں ہے
چنانچہ مامون نے اپنی لڑکی کی حضرت کے ساتھ شادی کر دی مگر جو توقع تھی وہ پوری
نہ ہوئی ثابت ہو گیا کہ یہ وہ افراد نہیں جن پر کوئی دنیاوی منتر کارگر ہو سکے۔ جس وقت
یہ حربہ بھی ناکام ہوا تو آخر میں وہی نتیجہ ہوا کہ جو ان کے والد بزرگوار کا ہو چکا تھا۔

امام محمد تقیؑ بہت کم عرصہ تک دنیا میں رہے اور اس کے بعد وفات پا گئے۔ زمانہ
ابتدا ساز گار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ امام محمد تقیؑ کو اشاعت تعلیمات مذہب کا
موقع بہت کم مل سکا ۔ اس کے بعد تو مصائب کا ایک سلسلہ ہے۔

امام علی نقیؑ کی بھی زیادہ عمر نہیں ہو سکی - اس مدت میں بھی آپ کی آزادی
بحال نہیں رہی بلکہ آپ کو نظر بندی کی صورت سے مدینہ سے سامرا بلایا گیا اور یہیں
آپ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

امام حسن عسکریؑ اپنے پدر بزرگوار امام علی نقیؑ کے ساتھ سامرا آئے تھے۔ پھر
وطن جانا نصیب نہ ہوا۔ باپ کی نظر بندی میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اسی قید میں
اُن کا دورِ امامت شروع ہوا۔ اور اسی قید میں ختم ہو گیا اور وفات ہو گئی۔
یہی عملی طور سے آپ کا دور بھی دورِ غیبت رہا۔ کیوں کہ آپ بحیثیت امام دنیا
کے سامنے نہ آ سکے۔

پھر جب کہ امام محمد تقیؑ سے امام حسن عسکریؑ تک یہ تمام ائمہ اس فضا میں
زندگی بسر کرتے رہے تو ان حضرات کو موقع کہاں ہو سکتا تھا کہ یہ عزائے امام حسینؑ کے

متعلق اپنے خیالات یا تاثرات کا اظہار کر سکیں۔ یا دوسروں کو بجائے مجلس وغیرہ کی دعوت دے سکیں۔

امام حسن عسکریؑ کا زمانہ۔ العظمۃ للہ۔ نہایت سخت دور تھا۔ متوکل کا عہد! یہ کھلم کھلا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا دشمن تھا۔ یہاں تک کہ اُس کی محفل میں جناب امیرؑ کی نقل کی جاتی تھی۔ اور قہقہے لگائے جاتے تھے۔ اسی دور میں قبر امام حسینؑ کے کھودنے کی کوششیں ہوئیں اور قبر پر ہل چلانے کے سامان کیے گئے۔ اور پانی نہر سے کاٹ کر قبر کو زیرِ آب بنانے کا ارادہ کیا گیا۔ یہ تمام کوششیں عہدِ متوکل کی یادگار تھیں۔ زمانہ کی ناسازگاری اس حد تک پہنچی کہ مشیت الٰہی نے اپنے نور کی حفاظت کے لیے غیبت کو ضروری سمجھا اور ظاہری طور پر کوئی امام زمانہ موجود نہیں رہا۔ ہاں تقریباً ستر برس تک اس کے بعد وہ زمانہ ہے جسے غیبت صغریٰ اور دورِ نیابت کہا جاتا ہے۔ یعنی اس میں ایسے افراد تھے کہ جو امام علیہ السلام کے نائبِ خاص تھے اور لوگوں کو تعلیمات پہنچاتے تھے۔ اگرچہ ان کو بھی آزادی حاصل نہ تھی مگر پھر بھی جس حد تک ممکن تھا اُنھوں نے اُس فرض سے غفلت نہیں کی جو ان کے پیشواؤں نے ان کے سپرد کر دیا تھا۔

عزاداری کا تیسرا دور ۲۶۰ھ سے گزشتہ صدی تک ائمہ معصومین کی کوشش جو نرم و گرم حالات میں برابر جاری رہی ایک ایسی جماعت کی تشکیل میں کامیاب

ہوئی کہ جو امام حسینؑ کی یادگار کا نہ صرف کبھی کبھی مظاہرہ کر لیتی ہو بلکہ حضرت کی یاد کو اپنا جزوِ زندگی بنا لے۔

دنیا میں جتنی بھی قومیں اور جماعتیں کسی اپنے بزرگ کی عزت کرتی ہوں اور اُس کی یاد کرتی ہوں وہ اس کو یاد کر لیتی ہیں مگر یاد رکھتی نہیں ہیں لیکن حسینؑ کی نام لیوا جماعت وہ ہے جو حسینؑ کو یاد کرتی نہیں بلکہ ہمیشہ یاد رکھتی ہے اور اس یاد کے مظاہرے فطری طور پر وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً پانی پیا اور حسینؑ کی پیاس یاد آگئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا۔ صلی اللہ علیک یا ابا عبد اللہ ۔ پنج وقتہ نماز پڑھی اور ہر نماز کے بعد رخ ہو گیا کربلا کی طرف (السلام علیک یا ابا عبد اللہ) کسی مصیبت زدہ کو دیکھا اور حسینؑ یاد آگئے۔ بلکہ اپنے اوپر کوئی مصیبت پڑی اور فوراً حسینؑ کا تصور دماغ میں گردش کرنے لگا اور زبان پر اُن کا ذکر آگیا اور چونکہ کربلا کا واقعہ مصائب کا مجموعہ ہے لہٰذا ہر مصیبت میں حسینؑ کا تصور ضروری ہے اور جو تکلیف ہو فوراً حسینؑ کے مصائب یاد آ جاتے ہیں۔ اس کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں کسی ایک شخصیت کے ساتھ بھی نہیں پائی جاتی۔

ذکرِ حسینؑ کے تازہ رہنے میں یوں تو خدائے قدوس کی جبار و قہار طاقت کی کارفرمائی شامل تھی مگر ظاہری اسباب کی بنا پر ظالم سلطنتوں کی عارضی کوششوں سے حالات کا غیر متوازن رہنا بھی اس کا باعث تھا۔

نفسیاتی طریقہ پر ایک چیز ایک حالت پر اگر قائم رہے تو پھر اُس میں کچھ

عرصہ کے بعد فرسودگی اور بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر رسمی طور پر وہ برقرار رہے بھی تو اُس میں کوئی خاص تاثیر نہیں رہتی۔ یا یوں کہا جائے کہ عادت ہو جانے کے بعد دماغ سے اُس کا علاقہ قائم نہیں رہتا۔

عزائے حسینؑ بھی اگر جاری ہوتی اور بلا مزاحمت ایک حال پر جاری رہتی تو شاید اُس میں کسی وقت یہ بے اثری کی کیفیت پیدا ہو سکتی اور لوگوں کو اُس کے متعلق ایک مساوات سا ہو جاتی مگر سیاست کی بدلتی ہوئی گردشوں کے ساتھ اس عزاداری میں مختلف اوقات میں رکاوٹ پیدا ہوتا اور پھر وقتاً فوقتاً اُن رکاوٹوں کے دور ہونے کے بھی مواقع حاصل ہوتا۔ اس نے عزاداری کو اور زیادہ فروغ دیا

قاعدہ ہے کہ پانی اگر دریا میں آزادی کے ساتھ بہتا رہے تو اُس میں وہ جوش وہ خروش، وہ روانی کا زور محسوس نہیں ہوتا۔ جتنا کہ کوئی بند باندھ دیا جائے اور پھر یہ بند ٹوٹے تو پانی ایک دم اتنی شدید قوت سے آگے بڑھے گا جس کے سامنے کوئی طاقت مشکل سے ٹھہر سکتی ہے

عزائے امام حسینؑ کے بارے میں اکثر یہی صورت ہوتی رہی۔ اسے ایک عام حالت سے جاری نہیں رہنے دیا گیا۔ بلکہ مختلف اوقات میں پابندیاں عائد ہوتی رہیں۔ ان پابندیوں نے کچھ عرصہ تک غم و رنج کے جذبات کو جو دلوں میں گھر کر چکے تھے دل ہی دل میں گھٹنے پر مجبور کیا۔ تھوڑے عرصہ تک ظلم و تشدد کے دباؤ سے یہ کیفیت قائم رہی اور پھر جب بھی یہ پابندی دور ہوئی اور ظلم کا شکنجہ ڈھیلا ہوا تو دبے ہوئے جذبات

ابھرے اور عزاداری ایک نئی زندگی اور تازہ جوش کے ساتھ قائم ہوئی۔ غور کیجیے تو تیرہ سو برس گزرنے کے بعد آج تک نہ یہ مختلف اوقات میں پابندیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور نہ عزاداری کی تازگی اور تاثیر میں کوئی کمی ہوتی ہے۔

متوکل کے دور کا فتنہ جس میں غیبت امام واقع ہوئی کچھ ہلکا ہوا۔ اس کے قتل ہونے اور اس کے بیٹے کے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے ساتھ۔ یہ بیٹا اس کا وہی تھا جس نے ایک روز امیر المومنین حضرت علیؑ کی نقل ہوتے ہوئے اور مضحکہ اڑاتے ہوئے دیکھ کر...... باپ کو ٹوک دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ارے کچھ نہیں تو کم از کم ہم اپنے کو اسی خاندان بنی ہاشم کا کہتے ہیں جس کے وہ بزرگ تھے تو ہمیں قرابت ہی کا خیال رکھنا چاہیے۔ مگر متوکل نے نشۂ شراب میں نہ صرف اس کی بات سے بے اعتنائی برتی بلکہ اس کا بھی توہین آمیز مضحکہ کیا اس طرح کہ یہ شعر نظم کیا:

غار الفتیٰ لابن عمہ　　　　رأس الفتیٰ فی بظر امہ

اور مطربوں سے کہا کہ اسی شعر کو آج گائیں چنانچہ آخر محفل تک یہی شعر گایا جاتا رہا۔ ظاہر ہے کہ ایک شاہزادہ کے دل پر اس رویہ کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متوکل اسی بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

ضرور اس کے بعد آل محمد کے خلاف فضا اتنی مکدر نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ پھر بھی مطلع پورے طور سے صاف نہیں ہوا۔

۲۴۶ھ سے ۳۳۴ھ تک سلسلہ نہایت قائم رہا۔ اس دوران میں چار

نائبین ہوئے۔ عثمان بن سعید عمری۔ محمد بن عثمان بن سعید۔ حسین بن روح نوبختی۔ علی بن محمد سمری۔ مرکز علم اس زمانہ میں قم تھا جس میں سے آخری نائب علی بن محمد سمری کے ہم عصر شیخ علی بن بابویہ قمی والد صدوق تھے۔ اور چونکہ نائبین کا قیام بغداد میں تھا۔ اس لیے یہ روحانی مرکز تشیع کا تھا اور یہاں بھی علماء کی کثرت تھی جن میں سے آخری نائب کے ہم عصر شیخ محمد بن یعقوب کلینی صاحب کافی تھے۔

یہ دور اس حیثیت سے بہت پُر آشوب ہے کہ جماعت کا اصلی سردار (امام) آنکھوں سے اوجھل تھا۔ نئے نئے لوگ امامت اور نیابت کے دعوے دار ہو کر سامنے آرہے تھے اور پھر بیرونی حملوں اور حکومت کی مخالفت کا سلسلہ بھی قائم تھا۔

ظاہر ہے کہ علم بھی بے عمل علماء کی بدولت اکثر خادم سلطنت و دولت رہا ہے۔ عزائے حسینؑ اور ذکرِ اہلِ بیت کے لیے جہاں سلطنت کی مادی طاقت صرف ہوتی رہی تھی گو ناکام سہی۔ وہیں علمائے سو کے پیدا کردہ اعتراضات علمی طور سے بھی حملہ آور رہے۔ گو حقانی براہین کے سامنے انھیں بھی شکست ہی نصیب ہوئی۔ لیکن ایسے اعتراضات سے ڈر کر اکثر حق کے نادان دوست بھی غلط عقیدوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اعتراض یہ ہوا کہ قرآن کا اعلان ہے کہ لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا یعنی کافر کو مؤمن کے خلاف قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ یزید اور اُس کا لشکر جو ایمان سے منحرف تھا وہ حسینؑ پر قابو پا جائے کہ جو مجسمۂ ایمان تھے۔ یہ عقل کے خلاف ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعۂ کربلا

غلط ہے۔ یہ شبہہ نکلا ہوا تو امام حسینؑ کے مخالفین کا تھا مگر اس سے مرعوب ہو کر بعض سادہ لوح افراد جو بخیال خود امام حسینؑ کی عظمت کو مانتے تھے انھیں بھی یہ عقیدہ ہو گیا کہ حسینؑ کو مسیح کی طرح آسمان پر اٹھا لیا ہو گا اور آپ ان مظالم کا نشانہ نہیں بن سکتے۔

یہ خیال شروع شروع امام رضاؑ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا اور امام رضاؑ نے اس شبہہ کو دفع بھی فرمایا۔ ارشاد کیا۔

- اما قول اللّٰہ عزّ وجل ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا فانّہ یقول ولن یجعل اللّٰہ لکافر علی مؤمن حجّۃ۔ یعنی یہ جو کہا گیا ہے کہ کافر کو مومن کے خلاف قدرت نہیں ہوتی۔ مراد اس سے دلیل و حجت میں غلبہ ہے مادی طاقت میں نہیں۔ انبیاء کو کافروں نے قتل کیا اور اس اعتبار سے ان کو غلبہ حاصل ہو سکا مگر یہ آیت اپنی جگہ درست رہی بایں معنی کہ مومن استدلال میں کمزور نہیں ہو سکتا۔ یوں ہی امام حسینؑ ظالموں کے ہاتھ سے شہید ہو گئے تو اس سے آیت کی صداقت پر کیا حرف آسکتا ہے۔ وہ خیال عرصہ تک پرورش پاتا رہا۔ یہاں تک کہ حسین بن روح کے سامنے یہی اعتراض پیش ہوا ان الفاظ میں کہ حسینؑ دوست خدا تھے اور ان کا قاتل دشمن خدا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا اپنے دشمن کو دوست کے خلاف قابو دے دے۔ حسین بن روح نے تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیا اور ایک طولانی تقریر فرمائی جس کا آخری حصہ یہ تھا کہ: لو جعلھم فی جمیع احوالھم غالبین و

قاهرین ولم یبتلہم ولم یمتحنہم لاتخذھم الناس الہۃ من دون اللہ ﷻ ولما عرف فضل صبرہم علی البلاء والمحن والاختبار ولکنہ عزوجل جعل احوالہم فی ذلک کاحوال غیرہم لیکونوا فی حال المحنۃ والبلوی صابرین وفی حال العافیۃ والظہور علی الاعداء شاکرین ویکونوا فی جمیع احوالہم متواضعین غیر شامخین ولا متجبرین ولیعلم العباد ان لہم الہا ھو خالقہم ومدبرہم فیعبدوہ ویطیعوا رسلہ وتکون حجۃ اللہ ثابتۃ علی من تجاوز الحد فیہم وادعی لہم الربوبیۃ او عاند وخالف وعصی وجحد بما اتت بہ الانبیاء والرسل ولیہلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ۔

(یعنی) انبیاء ہر حال میں اگر غالب ہوتے تو بہت سے لوگ اُن کو معبود مان لیتے۔ اس لیے اُن کو انسانی خصوصیات دیے گئے۔ وہی جسم اور گوشت، وہی طاقتیں اور قوتیں تاکہ اُنھیں عام انسان اپنی نوع میں داخل سمجھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہدایت کا مقصد ختم ہو جاتا۔ وہ دنیا کے لیے نمونہ نہیں بن سکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ وہ مصائب میں مبتلا ہوں۔ خدا کی راہ میں تکالیف اُٹھائیں تاکہ دوسرے اُن کے صبر و ہمت اور استقلال کو دیکھ کر سبق حاصل کریں اور اُن کا صبر و استقلال دوسروں کے لیے مثال بنے۔

اُس دن سائل یہ کافی وشافی جواب سن کر چلا گیا مگر پھر ذہن میں آیا کہ

یہ باتیں انھوں نے اپنی طرف سے کہیں یا امام زمانہ کے تعلیمات کی ترجمانی کی چنانچہ
دوسرے ان دل میں یہ تردد اور تشویش لیے ہوئے حسین بن روح کے پاس آیا۔
اُنھوں نے کہا کہ جو بتلایا گیا ہے مجھے وہی کہتا ہوں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔

اعتراضات پتہ دیتے ہیں کہ سخت اور ناسازگار ماحول کے باوجود
یادِ حسینؑ قائم تھی اور اسی لیے مخالف حلقوں کو اعتراض کی ضرورت ہوتی تھی۔

چوتھا دور

۳۲۹ھ میں غیبت کبریٰ ہوگئی۔ علی بن محمد سمری آخری نائب
خاص امام کے تھے جن کی وفات ہوئی اور اسی سال طبقہ علماء
میں سے محمد بن یعقوب کلینی صاحب کافی اور علی بن بابویہ قمی والد صدوق نے دنیا سے
رحلت کی۔ ان حادثوں نے ملتِ جعفریہ کی کمر کو خمیدہ کر دیا۔ مگر علمائے ملت خدا
اُن کی روحوں کو رحمت و قدس و رضوان کے خزانوں سے مالا مال فرمائے۔ دینِ حق
کی حفاظت کو کھڑے ہوگئے۔ اس گھٹا ٹوپ غیبت کے اندھیرے میں جب کہ ہاتھ
کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا اُنھوں نے اپنے نورِ علم سے دنیا کو روشنی پہنچائی اور عزائے
حسینؑ کو جس کا قیام ائمہ معصومین علیہم السلام کا نصب العین رہا تھا انھوں نے
بھی مختلف طریقوں پر اپنے پیشِ نگاہ رکھا۔ اس دور کے نمایاں افراد صدوق ابن
بابویہ قمی۔ محمد بن جعفر بن قولویہ۔ ابن نما وغیرہ ہیں۔ صدوق نے خود ذکرِ حسینؑ
بصورت مجالس شروع کیا۔ اس طرح کہ صدوق بیٹھتے ہیں۔ ایک کاتب کو پاس

بٹھا لیتے ہیں۔ ایک نشست میں جو کچھ صدوق فضائل و مصائب بیان کرتے ہیں کاتب لکھتا جاتا ہے نشست ختم ہوتی ہے اور یہ ہوتی ہے پہلی مجلس ۔ دوسرے دن صدوق پھر یوں ہی بیان کرتے جاتے ہیں اور کاتب لکھتا ہے ۔ بیان مکمل ہوتا ہے یہ ہوتی ہے دوسری مجلس ۔ اسی طرح ایک کافی ذخیرہ کتابی صورت میں جمع ہو جاتا ہے جس کا نام ہو جاتا ہے "امالی صدوق" امالی املاء کی جمع ہے جس کے معنی یہی ہیں کہ ایک آدمی بولتا جائے اور دوسرا لکھتا جائے ۔ یہ نثر کے مجالس کا تقریباً پہلا نمونہ ہے جو ہمارے پاس محفوظ ہے ۔ اس کے پہلے دربار ائمہ معصومین میں جو مجلسیں منعقد ہوئی ہیں وہ زیادہ تر بصورت نظم ہوتی تھیں۔ ابن قولویہ نے کتاب المزار لکھی جس میں امام حسینؑ کی زیارتیں درج کیں اور ابن نما نے مقتل تحریر فرمایا جو اب تک موجود ہے ۔

اب ہوا بھی ذرا ساز گار ہوئی ۔ دیلمی امراؤ سلاطین کا اقتدار قائم ہوا۔ رکن الدولہ، عز الدولہ، معز الدولہ، عضد الدولہ وغیرہ تمام آل بویہ کے صاحبان اقتدار افراد تھے جو ملت جعفریہ کے پیرو تھے ۔ انھوں نے عزائے امام حسینؑ کو بڑی رونق اور ترقی دی ۔ گو یہ حضرات رسمی طور پر خلفائے بنی عباس کے ماتحت تھے مگر ان کو شان و شوکت اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا کہ بغداد کی مرکزی سلطنت ان سے مرعوب تھی ۔ متوکل کا برباد کیا ہوا روضہ امام حسینؑ کا انھوں نے بنوایا ۔ نجف اور کربلا کے روضوں کی عمارتیں جو اب تک قائم ہیں انھی کی بنوائی ہوئی ہیں ۔ صفوی سلاطین نے

نوطلا کاری کرائی ہے یا ایوانوں کی تزئین وغیرہ کی ہے مگر اصل عمارت آل بویہ ہی کی تعمیر کردہ ہے

۳۵۱ھ میں معز الدولہ کے ایما سے بغداد میں عاشور کے دن یوم غم منایا گیا۔ اس دن دوکانیں بند کی گئیں۔ ہزاروں آدمی ماتم کرتے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں نکلے۔ اس سے قبل ایسا مظاہرۂ غم کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ جنہیں احساس غم نہ تھا اس وقت ماتم کی ہمہ گیری سے وہ بھی متاثر تھے۔ تمام دار السلطنت گونج رہا تھا اور عورت ومرد مصروف نوحہ وشیون تھے۔

مؤرخ یافعی نے مراۃ الجنان میں لکھا ہے کہ ۳۶۳ھ میں مصر اور بغداد وغیرہ میں شیعیت ابل پڑی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے ابلتی وہی چیز ہے جو پہلے سے جبر کے دباؤ سے دبی ہوئی موجود ہو مگر اس کے پہلے چونکہ آزادی نہ تھی اس لیے اہل دل کے دل میں حسرتیں گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھیں۔ اب جو آزادی ہوئی تو جذبات طوفان کی طرح امنڈ آئے۔

مصر میں فاطمیوں کی حکومت تھی۔ بنی عباس بنی فاطمہ سے خوف کھاتے تھے کیونکہ عوام ان سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ بنی عباس نے اس کا حل یہ سوچا کہ سلاطین مصر کے نسب کو مشکوک بنایا جائے۔ یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ یہ لوگ حقیقۃً سادات بنی فاطمہ میں نہیں ہیں۔ اس کے لیے محضر تیار کیا گیا اور اس پر بڑے بڑے لوگوں سے دستخط کرائے۔ اس زمانہ میں اشراف یعنی سادات علوی وفاطمی کو دار السلطنت بغداد

اور ممالکِ محروسۂ خلافتِ عباسی میں خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ تمام اشراف کے حقوق کے تحفظ اور نمایندگی کے لیے ایک نقیب الاشراف کا عہدہ مقرر کیا گیا تھا۔ یہ ایک بزرگ مرتبہ شخصیت سادات میں سے ہوتی تھی جو براہِ راست شہنشاہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور سادات کے معاملات، مقدمات اور حقوق وغیرہ کے لیے جب ضرورت ہوتی تو خود خلیفہ سے مل کر ان معاملات کو طے کراتی تھی۔ اس منصب نقیب الاشراف کا عہدہ حسین بن طاہر موسوی سے متعلق تھا جو سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور علامہ سید رضی جامع نہج البلاغہ کے والد بزرگوار تھے اور پھر خود جناب سید رضی بھی نقیب الاشراف کے عہدہ پر منتخب ہوئے۔

حکومتِ عباسیہ کی جانب سے سلاطینِ مصر کے نسب اور سیادت کو غلط ثابت کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں۔ اشرافِ بغداد کو دھمکیاں دی گئیں۔ علماء پر دباؤ ڈالے گئے۔ معززین کو ڈرایا دھمکایا گیا اور محضر پر دستخط لیے گئے۔ چنانچہ بہت سے دستخط ہو گئے اور بڑے بڑے لوگوں نے دستخط کر دیے۔ مگر ایک نقیب الطالبیین علامہ سید رضی رح ہی تھے جنھوں نے دستخط نہیں کیے اور صاف انکار کر دیا حالانکہ ان کے والد اور بڑے بھائی نے بھی بہت اونچ نیچ دکھائی اور سیاسی مصالح کی طرف توجہ دلائی مگر جناب سید رضی نے اس بارے میں کسی کا کہنا نہیں مانا۔

غرض ان سلاطین بنی فاطمہ نے مصر میں عزائے حسینؑ کو بڑا فروغ دیا۔ دس دن تک مسلسل مراسمِ عزاداری انجام دیے گئے اور ہر طرح سے اظہارِ غم کی کوشش

کی گئی مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ ایک دفعہ انقلاب ہوا اور سلاطین ایوبی کا دور دورہ ہوگیا۔ انھوں نے ایک ایک کرکے فاطمیین کی ہر نشانی کو مٹایا! اور ان کی کوششوں کے برخلاف جبری کوششیں کیں۔ چنانچہ یوم شہادت حسین کو یوم مسرت قرار دیا اور جشن و تظاہرہ شادمانی کے انتظامات کیے گئے۔ اس میں وقتی طور پر کامیابی ہوگئی اور لوگوں نے بجائے رنج کرنے کے خوشی منانا شروع کردی مگر فاطمیین نے جو تعمیری بنائیں آل محمد کی طرف خلق کو راجع کرنے کی قائم کردی تھیں، انھیں یہ نہ مٹا سکے۔ مشہد راس الحسین قاہرہ میں اس کے بعد بھی زیارت گاہ عام رہا۔ اور ابھی تک پورے شان و وقار کے ساتھ زیارت گاہ عام ہے۔

ایوبیین کا اثر وقتی ثابت ہوا اور سلاطین بنی فاطمہ نے دلوں پر جو اپنے اقتدار کے نقش قائم کیے تھے وہ اب تک مملکت مصر میں قائم رہے۔ چنانچہ اب جب کہ کتنی صدیاں حائل ہوگئیں اور کتنے انقلابات بیچ میں آگئے مصر میں سلاطین فاطمیہ کی یاد میں ہزار سالہ برسی منائی گئی اور اب جب کہ علم نے بہت سے پردے ہٹادیے ہیں تو کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں سلاطین بنی فاطمہ سے ان الزامات کو دور کرنے کے لیے جو ان کے خلاف ایوبی سلاطین نے عائد کیے تھے۔ یہ مادی اقتدار کا نتیجہ نہیں ہوسکتا کہ معزول شدہ سلاطین کی یاد تازہ رہے بلکہ یہ صرف عدل و انصاف اور حسن کردار کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

یہ دور وہ تھا جس میں طبقہ علماء میں سے جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ اور

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور سید رضی شریف موسوی موجود تھے۔ اس زمانہ میں مجالس کا کیا انداز تھا معلوم نہیں۔ مگر واقعاتِ کربلا اس وقت کثرت سے رواۃ اخبار کی زبانوں پر تھے۔ چنانچہ اسی دور کی تاریخ طبری ہے جس میں کربلا کے واقعات احادیث کی طرح معنعن اسناد کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ اگرچہ مؤرخ مذکور کا شیعہ مذہب سے تعلق نہیں ہے اس لیے بعض ویسے روایات بھی درج ہیں جنھیں ہواخواہانِ بنی امیہ یزید کی برارت کے لیے بیان کیا کرتے تھے مگر بہت سے واقعات کربلا کے ایسے بھی درج ہیں جو شیعہ جماعت کے اندر بھی اُس دور میں بیان کیے جاتے تھے۔ اس کا اندازہ یوں ہوگا کہ اُنھیں ارشادِ شیخ مفیدؒ کے روایات سے مطابق کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ دونوں میں چنداں تفرقہ نہیں ہے۔

باوجودیکہ طبری مقدم ہے اور ابو الفدار یا دیار بکری وغیرہ مؤخر ہیں مگر تاریخ ابو الفدار یا تاریخ خمیس دیار بکری میں کربلا کے عظیم الشان واقعہ کی نسبت صرف دو تین صفحہ کا موجود ہونا اور تاریخ طبری میں باوجود تقدم ان واقعات کے لیے بدرجہا زیادہ صفحات کا درج ہونا صاف بتاتا ہے کہ اس زمانہ میں کربلا کے واقعات کا تذکرہ شیعہ وسنی دونوں طبقوں میں پوری عظمت اور اہمیت کے ساتھ ہوتا تھا اور اس سے دونوں طبقے پورے طور پر متاثر تھے۔ یہ غالباً اثر تھا اُنھی مظاہراتِ عزاداری کا جو اُس زمانہ میں بغداد و مصر اور ایران میں پوری قوت کے ساتھ ہو رہے تھے۔

جناب شیخ مفید اور سید مرتضیٰ طاب ثراہ کے بعد طبقۂ علماء میں شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی رح کا زمانہ ہے۔ اس وقت دیالمہ کا اقتدار ختم ہو چکا تھا اور اس لیے اب خلافتِ عباسیہ کی فضا شیعوں کے لیے سازگار نہ رہی تھی۔ چنانچہ اسی دور میں بغداد کے اندر ایک شورش برپا ہوئی اور ایسی صورت ہوئی کہ وہ منبر جس پر بیٹھ کر شیخ طوسی طاب ثراہ درس دیا کرتے تھے جلا دیا گیا اور ان کی بیش بہا کتابوں کا بڑا حصہ بھی تلف ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں جناب شیخ الطائفہ کو ہجرت کر کے نجف اشرف جانا پڑا اور وہاں جا کر قیام کیا۔ یہ "چشمۂ شیریں" جو وہاں پہنچ گیا تو تمام تشنگانِ علم بھی وہیں پہنچنے لگے۔ اور اس دن سے نجف مرکزِ علم ہوا اور نجانے کس خالص نیت سے شیخ نے وہاں مرکز قائم کیا تھا کہ اس وقت سے اب تک نو سو برس سے زیادہ ہوئے مگر نجف بحیثیت علمی مرکز کے اب تک قائم ہے اور انشاء اللہ عرصہ تک اس کے بعد بھی قائم رہنے کی امید ہے۔

یہ پانچویں صدی ہجری کا تذکرہ تھا۔ شیخ طوسی رح کی وفات ۴۶۰ھ میں ہوئی ہے اس کے بعد چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں ایسا ہوا کہ نجف کے علاوہ حلہ بھی مرکزِ علم ہو گیا۔

یہ خلافتِ عباسیہ کا آخری دور تھا۔ اس وقت بغداد میں محلۂ کرخ شیعیانِ اہلبیت کا مرکز تھا۔ یہ لوگ عزاداری پورے انہماک کے ساتھ کرتے تھے مگر سوادِ اعظم کی مملکت میں ممکن نہ تھا کہ شہید کربلا کی عزاداری امن اور اطمینان کے ساتھ جاری

رہتی۔ فرقہ وارانہ کشمکش نے ایک دم ایسی ہولناک صورت اختیار کی کہ سلطنتِ عباسیہ کے ولی عہد کے حکم سے کرخ کے شیعوں کا قتلِ عام کر دیا گیا۔ یہ حادثہ عین عاشورہ کے دن کا ہے۔ لاتعداد آدمی قتل کیے گئے اور مکان لوٹے گئے۔ دجلہ میں اتنا خون بہا کہ کئی دن تک پانی خون سے رنگین رہا۔ اس خون نے یقیناً عزائے حسین کی رنگینی میں اضافہ کر دیا یعنی اس کے درد و اثر کو بڑھا دیا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتی طور پر اس کے بعد بغداد بلکہ پوری عباسی مملکت کے اندر کھلم کھلا عزاداری کرنے کے لیے بڑی جرأت و ہمت کی ضرورت تھی۔

ممکن تھا کہ اس طرح عزاداری کو نقصان پہنچ جاتا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ "با آلِ نبی ہر کہ در افتاد بر افتاد"۔ قدرت کو اس خوں ریزی اور سفاکی کا انتقام لینا چاہیے منظور تھا۔ انتقام لیا گیا۔ اور ایسا کہ سلطنت بنی عباس بھی اپنی پیش رو سلطنت بنی امیہ کی طرح حرفِ غلط کی طرح محو ہو گئی۔

اس وقت جب کہ تاتاریوں نے حملہ کیا ہے اور سلطنتِ بغداد تباہ ہوئی ہے تو حلہ ہی دارالسلام تھا۔ محقق نجم الدین ابوالقاسم جعفر بن سعید حلی صاحبِ شرائع کا زمانہ تھا۔ اس حملۂ تاتار کی مصیبت پر آج تک اسلامی تاریخ خون کے آنسو رو رہی ہے اور نوحہ و فریاد کی صدائیں بلند ہیں اور بڑی قیامت کی بات یہ قرار دی جاتی ہے کہ محقق طوسی ایسا قابل آدمی ہلاکو کے ساتھ تھا۔ مگر اس بات پر کبھی غور نہیں کیا جاتا کہ آخر اسلامی سلطنت میں کیا بات تھی جو خواجہ نصیر الدین طوسی ایسے انسان

کو غیر مسلم حکومت کے دامن میں پناہ لینے کی ضرورت محسوس ہوگی۔

یہ لوگ جو محقق طوسی پر کبھی دبی زبان سے اور کبھی علانیہ خفادت آمیز الفاظ میں چوٹیں کرتے ہیں کہ انھوں نے سلطنتِ اسلام کے ساتھ غدّاری کی یہ نہیں دیکھتے کہ اس نام نہاد اسلامی سلطنت کا ردّیہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس سلطنت کے ساتھ شریک ہو کر کام کیا کیا۔ کچھ ایسے عناصر پیدا کر دیے کہ زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پایا کہ کفر کا لباس اتر گیا اور اسلام کا لباس پہن لیا۔ یہ اور بات ہے کہ جو اپنے قدیم کیش کو چھوڑ کر حق کو اختیار کرنا چاہے وہ بلا تحقیق اس مذہب کی کسی شاخ کو کیوں قبول کرے۔ سلطان اولجائتو خدابندہ نے تمام علمائے اسلام کو جمع کیا۔ فریقِ اسلام کے علماء کے درمیان مناظرہ کرایا۔ علمائے جعفریہ میں سے آیۃ اللہ علامہ حلی طاب ثراہ بھی موجود تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد سلطان پر ثابت ہو گیا کہ اسلام میں مذہب حق صرف شیعہ مذہب ہے۔ چنانچہ اس نے مع ارکانِ سلطنت یہی مذہب اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سوادِ اعظم کے مؤرخین کو ان کے اسلام لانے سے بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

یہ تھا محقق طوسی کا فیض جس نے ایک دشمنِ اسلام جماعت کو بعد میں علمبردارِ اسلام بنا دیا۔ یہ جو ظالم ہونے کی مثال میں چنگیز اور ہلاکو کا نام ضرب المثل بنا لیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک پروپیگنڈا ہے۔ چونکہ ہلاکو کے ہاتھوں یہ ہوا کہ سلطنتِ بنی عباس ختم ہوئی اس لیے ہلاکو سے بڑھ کر ظالم، سفاک اور جابر کوئی نہیں رہا مگر اس داستان کی حقیقت اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ جن غریب مسلمانوں کو مسلمانوں

کے یہاں پناہ نہ ملتی تھی انھیں اُس ظالم اور سفاک کافر سلطنت میں پناہ مل جاتی تھی۔

یہ تو خود مسلمانوں کے شرمانے کی بات ہے کہ فرزندانِ اسلام کے ساتھ خود اُن کی سلطنت میں ایسی بدسلوکی ہوتی تھی کہ وہ کفرستان میں جاکر پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہوتے تھے۔ ہندوستان میں جو سادات آتے تھے وہ کہاں سے بھاگ کر آتے تھے۔ اس ذریعہ سے اُنھوں نے اپنی جانیں بچائیں مگر اکثر اُنھوں نے اپنے حسنِ عمل کا نمونہ پیش کر کے خود اپنے پناہ دینے والوں کو اپنے مذہب کی طرف متوجہ کر لیا۔ اعتراض کے قابل تو یہ تھا کہ یہ دوسروں کے پاس جاکر خود ان کے ایسے بن جاتے مگر اُنھوں نے دوسروں کو جب اپنا ایسا بنا لیا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

یہ سلطنت تاتار کے بعد کے افراد تھے جو اسلام کے علمبردار ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اسلام چونکہ محبت اہل بیت اور تشیع کی صورت میں اختیار کیا گیا تو اکثر مسلمانوں کو شاید اُن کا کافر رہنا اتنا ناگوار نہ ہوتا جتنا اس طرح سے مسلمان ہونا ناگوار ہو گیا۔

پانچواں دور اب جس وقت کہ سلطنت بنی عباس ختم ہو چکی تھی اور سلطنت تاتار بھی مسلمان اور محبِ اہل بیت ہو گئی تو پھر تو عزاداری کی اشاعت اور مجالس کے انعقاد اور ماتم حسین کی ترقی میں کوئی رکاوٹ باقی ہی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ترکستان، آذربائیجان، ایران اور عراق میں عزاداری پوری رونق اور شان سے ہونے لگی۔ اور ترقی کرتی رہی۔ یہاں تک کہ دسویں صدی ہجری

میں ایران میں ذاکری نثر اور نظم دونوں میں پورے شباب پر پہنچ گئی۔ اسی زمانہ میں ملا حسین کاشفی واعظ پیدا ہوئے جنھوں نے روضۃ الشہدا لکھی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ ہر ذاکر مجالس عزائے حسین میں اسی کتاب سے پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ذاکری کا نام ہی "روضہ خوانی" ہو گیا۔ یہ خود بھی بڑے واعظ تھے اور محبت اہل بیت میں سرشار تھے۔ ان کو اہل سنت اپنے عقیدہ کے علما میں محسوب کرتے ہیں مگر عقیدہ اُن کا تشیع کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان کے دو شعر بہت مشہور ہیں جو اُن کے عقیدہ کے ترجمان ہیں:

در نیتی سوال خلیل خدا بخواں   وز لا ینال عہد جوابش بکن ادا
گردد ترا عیاں کہ امامت نہ لائق است   آں را کہ بودہ بیشتر عمر در خطا

اسی طرح طبقۂ واعظین میں بہت سے علمائے اہل سنت تھے جو ذکر اہل بیت بڑے ذوق و شوق سے کرتے تھے جیسے علامہ ابن جوزی اور سبط ابن جوزی مؤلف تذکرۂ خواص الائمہ۔ اس سے آپ ملک کے عام مزاج کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب سلاطین صفویہ کا دور شروع ہو گیا اور انھوں نے ایران میں ہر ممکن طریقہ کی مذہب اہل بیت کی اشاعت کی۔ یہ لوگ کچھ شیعہ جماعت میں مذہبی طور پر ذمہ دار حیثیت تو رکھتے نہ تھے ممکن ہے کہ انھوں نے بعض مقامات پر اسلام کے پیش رو دوسری جماعت کے بنائے ہوئے سبق سے کام لیا ہو

- -

- -

یعنی جس طرح پیغمبر کے بعد اسلام پھیلایا گیا، اُنھی
یقوں سے ایران کے جس مقامات پر اسلام کے مسلکِ حق کو پھیلانے میں کام لیا گیا ہو
ارے نزدیک حکام و سلاطین کے عمل کی ذمہ داری مذہب پر عائد نہیں ہوتی۔ نہ
ام کے پھیلانے میں جو طریقے استعمال کیے گئے اُن کی ذمہ داری اسلام پر ہے اُسی طرح
طریقوں سے اگر شیعیت کی اشاعت میں کبھی کام لیا گیا ہو تو اُن کی بنا پر شیعیت کو
و الزام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مگر زیادہ تر کوشش اس بات کی تھی کہ وہ لوگ جن کے کان تک آواز نہیں
ی، اُن تک اہلِ بیت کے نام اور اُن کے اوصاف کو پہنچا دیا جائے۔ پھر جمال میں تو خود
شش ہے، وہ اپنی طرف دلوں کو موڑ ہی دے گا۔ چنانچہ درویشوں کو مناقب کی نظمیں
رائی گئیں، اشعار کہلوا کہلوا کر فقیروں کو دیے گئے کہ وہ پھیری لگا لگا کر دروازوں
ے رہا کریں۔ اس طرح سلاطین صفویہ نے ایرانیوں کو آلِ رسول سے شناسا
۔ پھر جب ایرانی یہ جان گئے کہ عرب کے نسلی تعصب اور افتخار کے خلاف جس نے
ان کو سربلندی عطا کی اور نسب میں اپنے ساتھ وابستہ کیا وہ یہی مظلوم اور غریب الوطن
جس کا نام حسین بن علی ہے۔ ورنہ عرب کے جاہل آدمی تو ملکِ عجم کے بادشاہ
لڑکی کو جو قیدی بن کر آئی تھی کنیزوں کے حکم میں سمجھنے پر تیار تھے مگر وہ علمبردار
افت علیؑ کی ذات تھی جس نے بڑھ کر روک دیا کہ خبردار اسے کنیز نہیں بنا سکتے۔
مبر کی ہدایت ہے کہ بادشاہوں کی لڑکیاں کنیز نہ بنائی جائیں۔ یہ اگر شاہزادی

ہے تو اب بھی شاہزادی رہے گی مگر اب تک دنیا کی شاہزادی تھی - اب بادشاہ دین کے گھر کی ملکہ بنائی جائے گی۔

حقیقت میں یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ صفوی سلاطین اتنے عرصہ کے بعد پیدا ہوئے اور کوئی ایسا شخص دوسرا اٹھا ہی نہیں جو ایرانیوں کی آنکھ سے غفلت کے پردوں کو ہٹائے۔ لیکن حقیقت میں ایران کو فتح کر لیا تھا جناب امیرؑ نے اسی وقت جب جناب شہربانو کا عقد امام حسینؑ کے ساتھ کیا اور پھر امام رضاؑ نے جب کہ ولی عہد سلطنت رہنے کے باوجود خراسان میں دنیا کو اہل بیت کی سادہ زندگی کا نمونہ دکھلایا۔ درمیان میں لوگ ظالموں کے اقتدار کے دباؤ اور ان کی کوششوں سے ناواقف ہو گئے تھے اور اہل بیت کو بھول گئے تھے مگر ادھر تعصب کی نقاب ہٹائی گئی اور حقیقت سامنے آئی اور ادھر حقانیت کی کشش نے سب کو جذب کر لیا

یاد رکھیے کہ پورا ملک ایک مرتبہ تبدیل ہو جائے، یہ بات تلوار کے جبر اور طاقت کے دباؤ سے کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ فطرت کا تجربہ اور خصوصاً اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ جہاں کسی قوم کے نظریات کو تبدیل کرنے کی جابرانہ کوشش ہوتی ہے اُس کی ضد اور کد بڑھتی جاتی ہے۔ اگر سلطنت کی طاقت کسی چیز کو فنا کر سکتی ہوتی تو نام اہل بیت کب کا فنا ہو جاتا کہ سلاطین کی منظم طاقتیں مل کر صدیوں تک اس کے مٹانے کی کوشش کرتی رہیں۔ معلوم ہوا کہ سلطنت کی طاقت کسی ملک سے اس کے مذہب یا کلچر کو ایک دم تبدیل نہیں کر سکتی پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک

بادشاہ مثلاً شاہ عباس صفوی پورے ملک کی ذہنیت کو بدل دے اور ایسی تبدیلی کہ نسلیں گزر جائیں اور وہ تبدیلی قائم رہے۔ یہ کسی ایک انسان کا عمل نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو صورت حال تھی وہ جبر و تشدد کی بنا پر عارضی طور سے تھی اور اب ذرا سا بھی سہارا مل گیا تو جو اصلی جذبات ملک کے تھے وہ ایک دم اُبھر آئے اور تمام ایران محبت اہل بیت میں سرشار ہو گیا۔

اس سے پہلے آپ کو یہ نظر آئے گا کہ زیادہ تر سواد اعظم کے علماء ایران کے ہیں جیسے نیشاپوری صاحب غرائب القرآن، غزالی، بیہقی، رازی، نسفی، جرجانی، تفتازانی، دوانی، جوینی وغیرہ وغیرہ لیکن دسویں صدی ہجری کے بعد کوئی ایک نمایاں شخص بھی نظر نہیں آتا اہل سنت میں سے جس کی نسبت ایران کی طرف ہو۔ اب سوائے محبان اہل بیت کے اور فرقہ کے افراد کی پیداوار ہی بند ہو گئی۔ حالانکہ اگر شاہ عباس صفوی کی نسبت اس بیان کو مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے کچھ تشدد سے کام لیا تو اس کے بعد تو ہر گز تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ کبھی اس بارے میں کسی تشدد سے کام لیا گیا ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پورے ملک کا حقیقی معنی میں مزاج تبدیل ہو گیا تھا۔ اب ایران میں ایک سرے سے دوسرے تک عزاداری اس شان سے ہونے لگی کہ جیسے کبھی اس سے پہلے نظر نہیں آئی تھی۔ اور مختلف صورتوں میں امام حسینؑ کے مجالس کی بنا ہونے لگی اور نظم و نثر دونوں میں ذکر حسینؑ نے ترقی کی۔ اگر ایک طرف روضۃ الشہداء لکھی گئی تو دوسری طرف مقبل، محتشم اور وصال ایسے شعراء اور مرثیہ گو پیدا ہونے

گئے۔ اب علامہ مجلسی کا دور آگیا۔ جو انھوں نے معارف وعلوم اہل بیت کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا اور اس طرح ایرانیوں کی نگاہوں کو جنھیں سلطنت نے مذہب اہل بیت کی طرف متوجہ کیا تھا انھوں نے معارف حقیقیہ سے روشناس کر دیا۔ یہ دو کام تھے جن میں سے ایک سلطنت کر رہی تھی اور ایک علماء کر رہے تھے۔ وہ خیال پیدا کرنے اور یہ حقیقت سے پردہ اٹھانے تھے۔ اس دوران میں ایران کے اندر بھی شیعہ کو بعض ناگوار حالات پیش آئے۔ مثلاً سلطان سلیم عثمانی بادشاہ ترکی نے ایران پر حملہ کر دیا اور تقریباً ستر ہزار آدمی قتل ہوئے۔ مگر اس سے شیعیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ خطرہ اُس وقت ہوتا ہے کہ جب کوئی چیز کسی تنگ دائرہ سے گزر رہی ہو لیکن جب کوئی دائرہ وسیع ہو چکا ہو تو اُس سے اگر کسی جگہ کے تمام افراد کو قتل کر دیا جائے تب بھی وہ مسلک ختم نہیں ہو سکتا۔ اب شیعیت کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ کسی جگہ کسی سلطنت کے بس کی بات نہیں رہی تھی کہ وہ تمام افراد کو قتل کر سکے مگر ان خوں ریزیوں سے یہ ہوتا تھا کہ واقعہ کربلا کی یاد تازہ ہوتی رہتی تھی۔ اور نئے درد وسوز کے ساتھ عزاداری قائم ہوتی تھی۔

ہندوستان میں عزاداری

ایران میں سلاطین صفویہ کا وہ دور تھا جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا اقتدار تھا۔ ایران میں شاہ عباس اور ہندوستان میں اکبر بادشاہ دونوں ہم عصر ہیں۔

ہندوستان میں عزاداری کی ابتداء تو اُن مہاجرین کے ساتھ ہوئی تھی جو اپنے شہروں سے بھاگ کر مختلف لباسوں میں آئے تھے۔ وہ ایک پناہ گزین کی حیثیت رکھتے تھے اور اُن کے قدم بھی پورے طور پر نہیں جمے تھے مگر اُن کی عزاداری میں ایک عجیب خلوص اور سوز و گداز مضمر تھا۔ اپنے دیس سے نکلے ہوئے انسان ظلم سہے اور مصائب جھیلے ہوئے۔ ایک غیر ملک میں جاکر حسینؑ کو یاد کرتے ہوں گے تو کتنے پُر درد اور پُر اثر طریقہ میں۔ ایسا جو غیروں کے دل کو بھی پانی کر دے۔

اس کے بعد جب سلطنتِ مغلیہ قائم ہو گئی تو مشہور بات ہے کہ تعزیہ سب سے پہلے تیمور بادشاہ نے بنایا مگر یہ ہماری کوتاہی معلومات ہے کہ اب تک اُس زمانہ کی تاریخوں میں اُس کے ماخذ کا پتہ نہیں چلا ہے۔ تزکِ تیموری کا حوالہ دیا جاتا ہے مگر تزکِ تیموری ایک نہیں تھی۔ بہت سی کتابیں تیمور کے حالات میں لکھی گئی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک کا نام تزکِ تیموری تھا۔ معلوم نہیں کس تزکِ تیموری میں اس کا تذکرہ تھا۔ اور اس تزکِ تیموری کا نسخہ اس وقت کہیں ہے یا نہیں۔ اس کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔ اس صورت میں یہ بھی مستند طریقہ پر بیان کرنا غیر ممکن ہے کہ تعزیہ بنانے کا اصلی سبب کیا ہوا تھا۔

بہر حال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ روضۂ حضرت امام حسینؑ کی زیارت کو ہر سال جانا نہایت دشوار تھا اس لیے اشتیاقِ زیارت کی پیاس بجھانے کے لیے تعزیہ کو بنایا تاکہ بجائے روضۂ مطہر کے اس تعزیہ کی

زیارت کر لیا کریں۔

جہاں تک دیکھا جاتا ہے عموماً ہندوستان نے اپنے تمدن و تہذیب میں ایران کی تقلید کی ہے۔ اگر تعزیہ ایران میں موجود ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ صرف ایرانیوں کی تقلید میں یہاں رائج ہوا لیکن تعزیہ عرب میں تو موجود نہیں اس لیے کہ وہاں اصل روضہ موجود ہے۔ ایران میں بھی بہت سے رسوم عزاداری ہوتے ہیں مگر تعزیہ جس شے کا نام ہے وہ ایران میں بھی نہیں ہوتی۔ اس کا صرف ہندوستان میں رائج ہونا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ کوئی خاص معنوی سبب تھا جو یہاں پیدا ہوا۔

تعزیہ کے طور پر اس وقت دو شکل کی چیزیں رائج ہیں۔ ایک کو تو تعزیہ ہی کہا جاتا ہے اور ایک کو ضریح کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ میں جہاں تک غور کرتا ہوں ضریح تو روضہ کے اندرونی حصہ کی نقل ہے اور تعزیہ باہر کا رخ ہے کہ جو ایوان کی طرف کا ہے۔ صحن اقدس حرم حسینی میں جا کر دیکھیے تو وہ شکل نظر آئے گی جس کی یاد تعزیہ کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے اور ایوان کے اندر جا کر دیکھیے تو وہ صورت دکھائی دے گی جو ضریح میں ہوتی ہے۔

تعزیہ پر اعتراض کیے جاتے ہیں کہ یہ بت پرستی ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب جذبات کے ہاتھ میں لگام نہیں رہتی تو پھر علمی حربے شروع ہو جاتے ہیں۔ یقیناً اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی اس کے خلاف سب سے بڑا الزام سمجھا جا سکتا ہے یہ کہ یہ غیر خدا کی پرستش ہے۔ مگر پرستش صرف نیت سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

عبادت کے معنی ہیں تعظیم۔ مگر بیٹا باپ کو دیکھ کر بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر کیا یہ پرستش ہے؟ اسی طرح باختلاف مراتب ہر معزز آدمی کی آپ تعظیم کرتے ہیں تو کیا یہ سب عبادت میں داخل ہے؟ حقیقت میں مطلق تعظیم عبادت نہیں ہے بلکہ عبادت وہ تعظیم ہے جو کسی کو خدا سمجھ کر یا حکم خدا کے مقابلہ میں کی جائے۔ لیکن اگر کوئی تعظیم خود حضرت احدیت کی طرف قریب یا بعید تعلق رکھنے سے ہو تو وہ تعظیم غیر خدا کی عبادت نہیں سمجھی جا سکتی۔ بلکہ کسی کی عظمت اگر رشتۂ ارتباط دور ہونے کے ساتھ قائم ہے تو وہ اس کی تعظیم بہت زیادہ ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی شخص آپ کے پاس آئے اور آپ اس کی تعظیم کو کھڑے ہو جائیں تو کوئی شک نہیں کہ یہ اس کی تعظیم ہے لیکن اگر اس کا لڑکا آئے اور آپ اس کی تعظیم کو سر وقد کھڑے ہو جائیں اس لیے نہیں کہ یہ شخص کچھ ہے بلکہ اس بنا پر کہ فلاں شخص کا لڑکا ہے تو یہ اس کی تعظیم بلند تر ہوگی اور جب فرزند بھی نہ ہو بلکہ اس کا غلام آجائے اور پھر آپ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں اس لیے کہ اس کا غلام ہے تو یہ اس شخص کی تعظیم کا اور بلند درجہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص کی عظمت کا اثر آپ کے دل پر اتنا ہے کہ اس کا کیا ذکر، اس کے بیٹے، بلکہ اس کے غلام تک کی عظمت کا آپ کے دل پر اثر ہے۔ غلام تو جاندار ہے۔ اگر اس کا خط آئے اور خط کو دیکھ کر آپ سر وقد کھڑے ہو جائیں اس لیے نہیں کہ یہ ایک کاغذ کا ورق ہے بلکہ اس لیے کہ اس پر اس کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ تو یہ خود اس شخص کی تعظیم کا ایک بلند درجہ

ہوگا کیوں کہ اس سے معلوم ہوگا کہ اُس کی عظمت کا آپ کے دل پر اتنا اثر ہے کہ اس انسان کا کیا ذکر اگر اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرچہ بھی ہوتا ہے تو آپ اُس کی اتنی تعظیم کرتے ہیں۔ یہ تعظیم کاغذ کی تھوڑی ہے بلکہ اُس شخص کی تعظیم ہے جس کی طرف اُس کاغذ کو قریب یا دُور کی نسبت حاصل ہے۔

اسی طرح اگر کسی خوش عقیدہ مسلمان کی باریابی خود حضرت احدیت کی بارگاہ میں ہو جاتی اور بالفرض اُس کا دستِ حق پرست بوسہ دینے کے لیے مل جاتا تو میں مانتا ہوں کہ وہ خداوند عالم کی تعظیم کا ایک مظاہرہ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے جب وہ نہیں ملا اور نہ کم سے کم اس دنیا میں اُس کے ملنے کی توقع ہے اور ہمارے عقیدہ میں تو کبھی بھی عالم مشاہدہ میں اُس سے ملنے کی توقع نہیں لیکن اُس کا رسول ملتا ہے اور انسان رسولؐ کے ہاتھ کا بوسہ دیتا ہے اس لیے نہیں کہ آپ عبداللہ کے فرزند ہیں اس لیے نہیں کہ آمنہ کے بیٹے ہیں، اس لیے نہیں کہ مکہ کے باشندہ ہیں، اس لیے نہیں کہ بنی ہاشم کی ایک فرد ہیں بلکہ اس لیے کہ اللہ کے رسول ہیں۔ تو یہ اُن کے ہاتھ کا بوسہ دینا اللہ کی تعظیم سے الگ کیوں سمجھا جائے۔ بلکہ یہ اللہ ہی کی تعظیم کا ایک بلند درجہ ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہم پیدا نہیں ہوئے۔ رسولؐ کے بعد دنیا میں آئے، اس لیے پیغمبر نہیں ملے مگر پیغمبر کی اولاد میں سے کوئی مل گیا اور ہم نے اُن سے اظہارِ عقیدت کیا، اُن کی تعظیم کی اُن کے شخصی صفات مادی کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ رسول اللہؐ کے

فرزند ہیں۔ تو بتائیے کہ یہ تعظیم اللہ کی تعظیم سے جدا کیوں کر ہے۔ بلکہ وہ اللہ کی تعظیم کا اُس سے بھی بلند درجہ ہے اور اگر پیغمبرؐ کبھی نہ ملے اور نہ اولادِ پیغمبر میں سے وہ جو اُن کے کمالات کے آئینہ دار تھے۔ جن کو پیغمبرؐ نے کاندھوں پر چڑھایا تھا اور زبان چوسائی تھی وہ بھی ہمیں نہ مل سکے۔ اور بدقسمتی سے صدیوں کی مسافت درمیان میں حائل ہو گئی۔ لیکن اب موقع ملتا ہے تو مدینہ پہنچ جاتے ہیں اور اُسی رسولؐ کی قبرِ مطہر کی زیارت نصیب ہوتی ہے اور ہم کمالِ اشتیاق میں اُسی قبرِ مطہر کو بوسہ دے لیتے ہیں تو کیا اس لیے کہ یہ ایک مٹی کا ڈھیر ہے بلکہ اس لیے کہ یہ رسول اللہؐ کی آرام گاہ ہے۔ یا اگر وہاں نہ پہنچے اور کربلا پہنچ گئے اور رسولؐ کے عزیز نواسے کی قبر مل گئی اور اُس قبر پر ہم نے عقیدت کے ساتھ بوسہ دے دیا۔ اس صورت میں یہ نہ کہنا چاہیے کہ قبر بے جان ہے۔ وہ خط بھی تو بے جان تھا مگر وہ اُس کاغذ کی تعظیم نہ تھی۔ اُس شخص کی تعظیم تھی جس کا خط ہے اسی طرح یہ تعظیم اُس مٹی کی، اُن تختوں کی، اُس گرد کی نہیں ہے جو قبر میں ہوتا ہے اگر فقط قبر ہی کی تعظیم کرنا ہوتی تو ہمارے شہر میں بھی بہت سی قبریں ہیں۔ جس قبر کی طرف چاہتے مڑ جاتے۔ یہ سیکڑوں روپے خرچ کر کے ہزاروں کا مڑن کا گرج کر کے، ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے جو جاتے ہیں تو اُس نسبت کی خاطر جو کسی قبر کو اللہ کے رسول یا رسول کی اولاد کی طرف ہے۔ پھر یہ تعظیم قبر کی کہاں ہوئی۔ یہ تو اُس کی تعظیم ہے جس کی قبر ہے اور وہ اگر حسینؑ ہیں تو اُن کی

تعظیم رسولؐ کی تعظیم ہے اور رسولؐ کی تعظیم اللہ کی تعظیم ہے جس کے وہ رسول ہیں۔
اور جب کہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ جتنا درمیان میں بُعد زیادہ ہو اتنا ہی تعظیم کا مظاہرہ اصل شخص کی تعظیم کا بلند تر درجہ ہوگا تو ماننا پڑے گا کہ اللہ کی عظمت محسوس کرتے ہوئے اس کے رسول یا اولادِ رسول کی قبر کی تعظیم اصل میں تعظیم خداوندی کا ایک بلند تر مظاہرہ ہے اس لیے وہ عین عبادتِ خدا ہے۔ شرک تو اس وقت ہو سکتا تھا جب کہ اس میں عظمتِ الٰہی کے سوا کوئی اور امر پیش نظر ہوتا۔

اب اس کے بعد کا یہ درجہ ہے کہ اگر قبر نہ مل سکی اور بدقسمتی سے وہاں نہ پہنچ سکے تو جذبۂ تعظیم کا تقاضا قوی ہو کہ اس قبر کی شبیہ بنا کر اس کا بھی احترام کیا جائے۔ یہ شبیہ چاہے کاغذ، پنی اور بانس کی تیلیوں ہی سے بنی ہوئی ہو لیکن تعظیم ان چیزوں کی تھوڑی ہی ہے۔ اگر ان کی تعظیم ہوتی تو جب تک اس شکل سے ان کی ترتیب نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی تعظیم کی جاتی مگر ایسا نہیں ہے۔ جب تک یہ شکل پیدا نہیں ہوئی تھی کوئی بھی پنی، کاغذ اور تیلیوں کا احترام نہ کرتا تھا۔ لیکن جب یہ شکل پیدا ہوئی تب احترام کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تعظیم ان چیزوں کی نہیں ہے بلکہ اس نسبت کی تعظیم ہے جو اس شکل سے پیدا ہو گئی۔ اب وہ قبر حسینؑ کی تصویر ہے اس لیے اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

اب اگر رسول کی تعظیم تعظیم خدا ہے ایک درجہ بلند اور اہل بیتِ رسول کی تعظیم خدا کی تعظیم ہے دو درجہ بلند اور ان کے قبور کی تعظیم تعظیم الٰہی ہے چار درجہ بلند تو ماننا

پڑے گا کہ شبیہ قبر کی تعظیم اس رشتۂ عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو خدا کے ساتھ جا کر ملتا ہے خداوند عالم کی عظمت کے احساس کا ایک بلند ترین درجہ ہے اس لیے اگر وہ عبادت ہے تو اللہ سبحانہ ہی کی عبادت ہے۔ کسی غیر کی شرکت کا اس میں شائبہ بھی نہیں ہے۔

حقیقت میں حضرت امام حسینؑ نے خود ایک لفظ میں بتا دیا تھا کہ اگر کسی چیز کی زیارت کرنا ہو اور وہ نہ ملے تو شبیہ دیکھ لو۔ تمہاری زیارت پوری ہو جائے گی اس وقت جب علی اکبر رخصت آخر کے لیے آئے۔ امام نے بارگاہ الٰہی میں جو مناجات کی تھی اس میں عرض کیا تھا کہ خداوندا جب ہم تیرے نبی کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اس جوان کو دیکھ لیتے تھے اس لیے کہ یہ تیرے رسول کی شبیہ ہے یاد رکھیے کہ اسی سے ہم نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ جب ہم زیارت قبر حسینؑ کے مشتاق ہوتے ہیں تو ضریح اور تعزیہ کو دیکھ لیتے ہیں اس لیے کہ یہ قبر حسینؑ کی شبیہ ہے۔

تعزیہ کی بنیاد چاہے تیمور کے دور میں پڑ گئی ہو مگر اس کے بعد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں عزاداری کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ بعد کے سلاطین محبت اہل بیت میں ویسے مستغرق نہ تھے جیسے تیمور بادشاہ۔ اکبر کا دور تاریخ ہند میں اگرا زریں دور ہے مگر شیعیت کو اجتماعی حیثیت سے کوئی منظم صورت حاصل نہ تھی۔ جہانگیر کے دور میں تعصب کا بھی کارنامہ کیا کم ہے کہ قاضی نور اللہ شوستری بجرم تشیع قتل کر دا ئے گئے جو ہندوستان میں "شہید ثالث" کے لقب سے مشہور ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی بہت محتاط طریقہ سے گزری تھی اور اشاعت مذہب کا موقع ان کو نہیں ملا۔ صرف ان کی کتاب بے طور

یادگار رہی جس کا نام "احقاق الحق" ہے۔ مگر اُن کی زندگی میں وہ بھی چراغ زیر دامن کی طرح مستور رہی۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کے وسیع ذرائع خبر رسانی نے اُس کی اطلاع ظالم حکومت تک پہنچا دی اور وہ اُن کے لیے سبب شہادت بن گئی۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ملت جعفریہ کی اشاعت کا کام اُن کے ہاتھ سے کیا انجام پایا۔ اُن کو اس کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ ایسی صورت میں ترویج عزاداری کا توقع کہاں؟

بے شک دکن میں قطب شاہی حکومت محب اہل بیت تھی۔ برہان شاہی حکومت نے بھی طاہر دکنی کے ہاتھ سے ائمہ معصومین کی ایک کرامت ظاہر ہونے کے بعد شیعہ مذہب اختیار کر لیا اس لیے عزاداری بہت شان سے ہونے لگی مگر ان کا محبت اہل بیت میں استغراق اور عزاداری میں انہماک ہی اورنگ زیب بادشاہ دہلی کے لیے بنائے مخاصمت بن گیا اور نتیجے میں دکن کی تمام شیعی حکومتیں ختم ہو گئیں اور پھر عزاداری کے لیے فضا ناسازگار ہو گئی۔ اس وقت اور اس کے بعد ہندوستان میں عزاداری ہوتی تو ضرور تھی مگر اُسے کوئی ترقی پذیر صورت حاصل نہیں ہوئی تھی یہاں تک کہ اودھ کے دار السلطنت لکھنؤ کے افق پر حضرت غفرانمآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ آفتاب علم بن کر چمکے اور شیعیت کی تعلیم اور ملت جعفری کی اشاعت کا مرکز قائم ہو گیا۔ رجب ۱۲۰۰ھ میں سب سے پہلی نماز جماعت تھی جو شیعی طریقہ سے لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ آپ نے عزاداری کی اشاعت میں بھی پوری جد وجہد صرف فرمائی اور وہ فروغ دیا جو ترقی پذیر صورت سے اب تک قائم ہے۔ ایک طرف نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم کے دل میں عزائے امام کے ذوق

دمشق کی روح پھونک کر حسینیہ آصفی کی بنا ڈلوائی جو ہندوستان بلکہ دنیا کا سب سے بڑا امام باڑہ ہے اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے بیتاحاتِ عالم کا مرکز ہے۔ دوسری طرف خود ایک عزا خانہ لکھنؤ میں بنوایا جو حسینیہ غفران مآب کے نام سے مشہور رہے۔ خود اس کے "در و دیوار شکستہ" مادی حیثیت سے کسی عظمت کے مظہر نہیں ہیں مگر اپنے روحانی اور معنوی خصوصیات کے لحاظ سے یہ مانی ہوئی بات ہے کہ وہ ہندوستان کی متبرک ترین جگہ ہے اور ایک عزا خانہ اپنے پیدائشی وطن نصیر آباد میں بنوایا۔ وہ بھی کسی نہ کسی حالت میں اب تک قائم ہے۔

آپ کو عزائے امام حسینؑ میں اتنا انہماک تھا کہ اس اجازۂ اجتہاد میں جو جناب سلطان العلماء صاحب شاہ کے نام لکھا تھا وصایا میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ عزائے حسین میں انہماک کبھی کم نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آپ کے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ اور اس وقت سے اب تک عزاداری میں ہندوستان کی ترقی ہوتی رہی ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ ترقی ہوتی رہے گی۔

سلاطین اودھ نے خدا اُن کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اس مقصد کے حصول میں جان لڑا دی۔ ایک طرف علمائے آل غفران مآبؒ کی مذہبی کوششیں اور دوسری طرف ان سلاطین اولوالعزم کی مالی فیاضیاں اور حوصلہ مندانہ کاوشیں دونوں نے مل کر ہر طرح کے ممکن ذرائع سے عزاداری کی اشاعت کی۔ چونکہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف قومیں موجود ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ ایسے طریقے اختیار

کیے جائیں جن سے ناواقف لوگ واقف ہوں اور غیر اپنے بن سکیں۔ اس کے لیے
مختلف قسم کے نوحے، ماتمی جلوس، شبیہیں، علم اور مجالس میں عمدہ سے عمدہ حصص کی
تقسیم وغیرہ کے انتظامات کیے گئے۔ پھر بادشاہ اودھ اور اُن کی دیکھا دیکھی دوسرے رؤسا
نے شب ہائے عاشورا اور دیگر ایام محرم میں عزاخانوں میں گشت لگا کر تعزیوں پر
کچھ چڑھانے کی رسم قائم کی جس سے جذبہ تعزیہ داری دوسرے مذاہب کے عزاداروں میں
بھی پیدا ہو گیا۔ یہ اصل میں ایک انسانی فطرت تھی کہ حسینی قربانی کے فیوض اور اُس کے
یادگار برکات سے دوسری جماعتیں بھی مستفید ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عزاداری ہر طبقہ
اور ہر ملک کے ہر حصہ میں پورے تزک سے ہونے لگی۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ یہی ترک
قوم اور اُس کا سلطنتیہ خاندان جس سے سلاطین اسلام سے لڑائیاں رہی تھیں اور جس
کے ذمہ دہلی کی کشت و خون کے سلسلہ میں تاریخ بڑے الزامات عائد کرتی ہے اُسی خاندان
کی سلطنت گوالیار حسینؑ مظلوم کی سب سے بڑی عزادار ہو گئی اور یہ حسینی کرم تھا اور خالق
کا حسینی عزاداری کی تدریج میں انتظام تھا کہ امام حسینؑ کے قتل سے اپنوں کی حاجت روائیاں
نہیں ہو رہیں حسینی منبروں کی ہو رہی ہیں۔ گوالیار میں حسینی عزاداری میں بڑی حد تک ان
معجزات اور کرامات کا ہاتھ تھا جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے
ایسے مقامات ہیں جہاں اذان کی آواز نہیں سنائی دیتی مگر محرم میں صدائے حسینؑ کی آواز
وہاں بھی گونجتی ہے۔ اس دور میں بھی جب فرقہ وارانہ تعصبات انتہا کو پہنچ گئے ہیں سیمینار یادگار حسینی ۱۳۹۶ھ
کی تحریک نے ثابت کر دیا کہ حسینیت اب بھی تمام اقوام و مذاہب کے لیے نقطۂ مشترک بن سکتی ہے اور عزائے حسینی
قوم و مذہب کی تفریق سے بالاتر ہے۔

دینی کتابیں

اس عام بے اطمینانی، بے چارگی، پریشاں حالی، کس مپرسی، تنگ نظری اور لا مذہبیت کے زمانے میں بے انتہا ضروری ہے کہ افرادِ قوم لازمی طور پر مذہبی کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں اور اپنے بچوں کو تاکید سے پڑھوائیں۔ اس شدید تاریکی کے زمانے میں صرف مذہب ہی سکون، استغفار، اطمینان، خوشحالی، تقویت اور وسیع النظری پیدا کر سکتا ہے۔ شانتی اور آشتی کی برکتیں صرف خدائی قانون ہی کے اندر جلوہ گر ہیں۔ مذہبی اُصول زندگی کے علاوہ اس وقت دنیا میں جتنے بھی حکومت کرنے کے طریقے ہیں سب ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ اہلِ بصیرت کو چاہیے کہ وہ جلد سے جلد امامیہ مشن لکھنؤ کی فہرست کتب طلب کریں۔

اب تک اس مذہبی مشن نے نظام الٰہی کے مختلف شعبوں پر ایک سو بارہ ۱۱۲ کتابیں شائع کی ہیں۔ افرادِ مذہب جتنی جتنی اپنے اس مشن کی ہمت افزائی فرمائیں گے اتنا ہی زیادہ اس کو مذہبی خدمتیں کرنے کا موقع ملے گا۔

خادم مشن

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری

پبلشر

سید آفاق حسین رضوی آنریری سکریٹری
امامیہ مشن، لکھنؤ

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس لکھنؤ

رسالہ
نمبر ۱۱۲ امامیہ مشن لکھنؤ

قیمت : ۴۱ر
محصول : ۲ر